رامپور رضا لائبریری

مارچ ۱۹۶۵ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

# نگار پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

عنقریب شائع کیا جا رہا ہے

## نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

★

# ماجدولین نمبر

فرانسیسی ادب لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جس کی نظیر کسی زبان کے ادب میں آپ کو نظر نہ آئے گی !!

★ اسے پہاڑوں نے سُنا اور کانپ اُٹھے ★

★ زمین نے سُنا اور تھرّا اُٹھی ★ خدا نے سُنا اور تادیر ملول رہا۔ اف رے

★ جسے رُوح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔

## مُحبت کا خراج

صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے امنڈتے اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں۔

★ اور ممکن نہیں

★ یہ سانحہ پڑھکر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔

قیمت :- تین روپے ۳

نگار پاکستان ★ ۳۲ گارڈن مارکٹ ★ کراچی۔۳

# نگار پاکستان کا خاص شمارہ

# نظیر نمبر

مرتبہ:- نیاز فتحپوری

جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اُردو کلام میں عارفانہ رنگ، اس کی قدرتِ بیان و زبان، اس کا معیاری تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعراء کا فرق، معاصرین کی رائیں، مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اسکی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

اس خاص نمبر کے ترتیب میں بڑی دماغ سوزی، جگر کاوی اور قابل قدر تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے اور نظیر اکبر آبادی کے موافقین و مخالفین کی رایوں پر فاضلانہ اور بے لاگ تبصرے کئے گئے ہیں۔ اسی طرح یہ خاص نمبر اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے ریسرچ کے طلباء اور شائقین ادب کے لئے بیحد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قیمت:- فی کاپی تین روپے۔

**ادارہ ادب عالیہ کراچی ۱۸**

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲
ٹیلیفون نمبر ۴۳۶۹۳ ۷
مارچ ۱۹۶۵ء

# نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

نائب مدیران
ڈاکٹر فرمان فتحپوری
عارف نیازی

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی پرچہ
پچھتر پیسے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی / ایف یو پی بی ۳۶۶۹ - ۶۲/۶۸ - محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر و پبلشر:- ایم عارف نیازی نے مشہور آفسٹ پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا

# پانچ روپے والے

## ۵ روپے والے بانڈ خریدنے کے

## ۶ فائدے

- ہر سلسلہ میں ہر سہ ماہی پر ۵۰،۰۰۰ روپے کے انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔
- صرف ۵ روپے میں آپ ۱۰،۰۰۰ روپے تک کا انعام جیت سکتے ہیں
- ہر بانڈ پر انعام حاصل کرنے کے ۲۰۱ مواقع ہیں۔
- بانڈ نقدی سے بہتر ہیں۔ ان کا خریدنا اور بیچنا آسان۔ پاس رکھنا سود مند۔
- جیتنے والے بانڈ آئندہ قرعہ اندازیوں میں بھی شامل رہتے ہیں۔
- بانڈ تمام منظور شدہ بینکوں، ڈاکخانوں اور ذیلی ڈاکخانوں سے دستیاب ہیں۔

قرعہ اندازی میں شامل ہونے کے لئے بانڈ تاریخ سے
کم از کم ایک ماہ پہلے خریدنا ضروری ہیں۔

# انعامی بانڈ

# نگار پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۵ء

# جدید شاعری نمبر

## ہوگا

جس میں جدید شاعری کے آغاز، ارتقا، اسلوب، فن اور موضوعات کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی جائے گی اور اس انداز سے کہ یہ بحث آپ کو حالی و اقبال سے لیکر دورِ حاضر تک کی شعری تخلیقات و تحریکات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔

## اس کے چند عنوانات

جدید شاعری کے اولین محرکات، جدید شاعری کی ارتقائی منزلیں، جدید شاعری کی داخلی و خارجی خصوصیات جدید شاعری اور اس کے اصناف۔ جدید شاعری میں ابہام و اشاریت کا مسئلہ، جدید شاعری میں کلاسیکل عناصر جدید شاعری کی تحریکات، جدید شاعری کی مقبولیت و عدم مقبولیت کے اسباب، نظم آزاد، نظم معریٰ سانٹ اور جدید غزل کی خصوصیات، جدید شاعری کے نمایاں موضوعات و رجحانات۔ جدید شاعری کا سرمایہ اور اس کی ادبی قدر و قیمت وغیرہ

**اُردو کے تقریباً سارے ممتاز اہل قلم اس نمبر میں حصہ لے رہے ہیں**

خریدارانِ نگار کو یہ نمبر مفت پیش کیا جائے

ادارہ

دا ہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا

# فہرست مضامین

| ۴۴ واں سال | مارچ ۱۹۶۵ء | شمارہ (۳) |
|---|---|---|


| مضمون | مصنف | صفحہ |
|---|---|---|
| ملاحظات ۔ ۱۔ ذہنی ارتقاء ۲۔ بھارت اور مسئلۂ زبان ۳۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری | نیاز فتحپوری | ۵ |
| ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستان کی مدح | صباح الدین عبد الرحمٰن | ۹ |
| معائب شاعری | رشید حسن خاں | ۱۹ |
| انسان کی ذہنی تاریکی کا عبرتناک دور | نیاز فتحپوری | ۳۰ |
| جدید شاعری ادب | ڈاکٹر اعجاز احمد | ۳۲ |
| عبد اللہ بن سبا اور قتل حضرت عثمان | نیاز فتحپوری | ۴۳ |
| رزمیہ بحر اور سحر البیان | فرمان فتحپوری | ۴۹ |
| شعر حسن صداقت اور انسانیت کا ترجمان ہے | خواجہ غلام السیدین | ۵۳ |
| باب الانتقاد ۔ خدا کی بستی | اے ۔ بی ۔ اشرف | ۵۷ |
| باب المراسلہ والمناظرہ ۔ سید محمد | نیاز فتحپوری | ۶۶ |
| باب الاستفسار ۔ ۱۔ کوہ و دمن ۲۔ تشریح شعر ۳۔ اہل سنت کی وضاحت | نیاز فتحپوری | ۷۰ |
| منظومات ۔ محبوب الرحمان وامق ، شفقت کاظمی ، اکرم دھولیوی ، واحد پریمی ، الطاف شاہد ، ساحر کھوپالی | | ۷۳ |
| مطبوعات موصولہ | نیاز فتحپوری | ۷۷ |

# ملاحظات

## ذہنی استعمار

ہمارے قدیم علمائے منطق نے انسان کو حیوانات سے متمایز کرنے کے لئے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ:۔ "ہو حیوان ناطق، مستقیم القامت، یتحرک بالارادۃ" یعنی وہ حیوان ہے جو نطق پر قادر ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر چلتا ہے، اور اپنے ارادہ سے حرکت کر سکتا ہے۔ لیکن یہ تعریف محض جسم انسانی کی ہے نفس انسانی کی نہیں البتہ فرشتوں نے انسان کا تعارف جن الفاظ کے ساتھ کیا تھا وہ بیشک ایسی جامع و مانع تعریف ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اسکی صداقت واضح ہوتی جاتی ہے۔

انھوں نے انسان کی تعریف صرف دو فقروں میں کی ہے "یفسد فی الارض و یسفک الدماء" یعنی یہ وہ مخلوق ہے جو زمین میں صرف فساد پھیلائے گی، خون بہائے گی۔

ہر چند خدا نے فرشتوں کی اس بات کو پسند نہیں کیا اور اس نے انسان کو اپنا خلیفہ و نائب بنا کر دنیا میں بھیج ہی دیا۔ اس توقع کے ساتھ کہ وہ فرشتوں کی پیش گوئی کو غلط ثابت کر دکھائے گا۔ لیکن خدا کی یہ توقع پوری نہ ہوئی اور انسان نے دنیا میں آکر وہی کیا جو فرشتوں نے کہا تھا۔ کیونکہ خدا کا نائب و خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان خدائی جذبۂ تسلط و اقتدار بھی اپنے ساتھ لایا اور اس کا استعمال سب سے پہلے اس نے اپنے ہی ابنائے جنس پر کیا اور ایک لا تناہی سلسلہ فساد و خونریزی کا شروع ہو گیا۔ اسی جذبہ نے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔ ہزارہا بھری آبادیوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اس کا نام بدلتا رہا۔ پہلے اس کا نام ملوکیت، استبداد و آمریت تھا۔ جس نے چنگیز، ہلاکو، ہنی بال، نپولین وغیرہ پیدا کئے بعد میں اسے فسطائیت و نازیت کہنے لگے جو ہٹلر و مسولینی کی صورت میں ظاہر ہوئی اور پھر استعمار ارضی جس کا سب سے بڑا علمبردار برطانیہ تھا اور گو اب یہ چیز تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس کی جگہ اس سے زیادہ خطرناک استعمار نے لی ہے جس کا نام استعمار ذہنی ہے۔۔۔ اور جمہوریت و اشتراکیت بھی۔

اس ذہنی استعمار کی تاریخ دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جب حکومتیں دو گروپ میں تقسیم ہو گئیں، ایک جمہوری دوسرا اشتراکی اور انھیں دونوں کے جذبۂ تفوق و اقتدار کی کشمکش کا نام موجودہ عالمی سیاست ہے یا روس و امریکہ جن کی ایک ایک شکن پیشانی اور جنبش ابرو سے تقدیر امم بنتی اور بگڑتی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت اقصائے عالم کی کوئی قوم یا حکومت ایسی نہیں ہے جو ان میں سے کسی ایک کی دست نگر نہ ہو اور اپنے وجود و ثبات کے لئے ان کا دامن پکڑنا ضروری نہ سمجھتی ہو۔ اسی چیز کو میں ذہنی استعمار کہتا ہوں جو روس و امریکہ نے دنیا میں قائم رکھا ہے اور اس سے مفر کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ہم نے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے جو اصول بنا رکھے ہیں وہ انھیں دو یاجوجی و ماجوجی قوتوں سے مستعار ہیں اور ہم اپنی تمام زندگی اُن کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔ ہماری معاشرت، ہمارے ذہنی رجحانات، ہمارے مشاغل حیات ہیں اب کوئی چیز ایسی نہیں جسے ہم اپنی کہہ سکیں اور خود ہی اس کی بقا کے ذمہ دار ہوں۔ یہاں تک کہ ہم اپنی زمینوں سے غلہ بھی نہیں اُگا سکتے اور فاقہ کشی کی مصیبت سے بچنے کے لئے ہمیں دست سوال انھیں کے سامنے پھیلانا پڑتا ہے۔ غذا کے مسئلہ کو چھوڑ کر زندگی کے دوسرے مسائل

معیشت و معاشرت کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی ہمارے اپنے نہیں ہیں بلکہ ان میں بھی ہم ان ہی کی نقالی کرتے ہیں اور ان ہی کی فراہم کی ہوئی اشیاء کے محتاج ہیں۔ الغرض ہم نے اپنی زندگی، اپنی روح اور اپنا سب کچھ ان کے ہاتھ فروخت کردیا ہے اور جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے عوض ہم کو کیا ملتا ہے تو بے اختیار عرفی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ :-

دراں دیار بہ سودا رود دلم کہ دہند

جوے ملال بہ عمر ابد بہ دشوازی

## بھارت اور مسئلۂ زبان

اس دوران میں بھارت کو ایک بڑے سخت مرحلہ سے گزرنا پڑ رہا ہے اور وہ مرحلہ زبان کا ہے آزادیٔ ہند کے بعد بھارت نے یہ فیصلہ تو کردیا تھا کہ اس کی قومی زبان ہندی ہوگی اور رسم الخط ناگری، لیکن اسی کے ساتھ چونکہ وہاں کی تمام آبادی اس رسم خط سے آگاہ نہ تھی اور ہندی زبان بھی سارے ملک کی زبان نہ تھی اسلئے انگریزی کو بدستور قائم رکھا گیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ لوگ ہندی زبان اور ہندی سے واقفیت کرلیں اور اس کی جو مدت مقرر کی گئی تھی وہ فروری میں ختم ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اصولاً تمام دفاتر کی زبان انگریزی کی جگہ ہندی ہوجانا چاہئے تھی لیکن جنوبی ہند نے اس کو نہیں مانا اور اس کے خلاف سخت جارحانہ اقدام شروع کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے انگریزی کو بھی فی الحال معاون زبان کی حیثیت سے قائم رہنے دیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حکومت نے اپنی پالیسی کیوں بدل دی۔ غالباً اس لئے کہ وہ اس شورش سے ذرا گھبرا گئی۔ لیکن اس کا ردِ عمل جن سنگھ پارٹی پر یہ ہوا کہ اس نے بھی ہندی کی حمایت میں وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو جنوبی ہند نے اس کی مخالفت میں اختیار کیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں بھارت کا یہ خیال کہ اس کی کوئی قومی زبان بھی ضرور ہونا چاہئے اپنی جگہ بالکل درست ہے اور ایک آزاد ملک کے لئے یقیناً یہ بات قابلِ شرم ہے کہ وہ کسی غیر زبان کو اپنے اوپر مسلّط رکھے۔ لیکن اس کو یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ بھارت کی ۴۵ کروڑ آبادی کو جو درجنوں مختلف زبانیں بولتی ہے، کیونکر کسی ایک مخصوص زبان و رسم خط تسلیم کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ خاص کر اس صورت میں جبکہ اس دوران میں ہندی زبان کا جو نمونہ اس نے پیش کیا ہے وہ دراصل یہاں کے کسی خطہ کی زبان نہ تھی۔ اس نے قومی زبان کا نام ہندی تو رکھ دیا۔ لیکن اسے بدلنا شروع کیا سنسکرت میں جسے بھارت کے اکثر صوبوں نے پسند نہیں کیا اور آغاز ہی میں ہندی کی طرف سے لوگوں میں تنفر سا پیدا ہو چلا۔ اگر بھارت صرف رسم الخط بدل کر ناگری کر دیتا اور زبان وہی رکھتا جو عام طور پر رائج ہے تو یہ اختلاف کبھی نہ پیدا ہوتا۔ اب رہا سوال اصطلاحات کا سو وہ بھی آسانی سے یوں طے ہوسکتا تھا کہ انھیں جوں کا توں برقرار رکھا جاتا۔ سنسکرت میں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

روس میں بھی خدا جانے کتنی زبانیں رائج ہیں لیکن ان کی قومی زبان سے جو خاص قسم کی روسی ہے وہ کبھی متصادم نہیں ہوئیں کیونکہ کسی کو اپنی زبان ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا اور انھیں کی زبان میں ان سے سلسلۂ مواصلات و تبادلۂ خیالات برقرار رکھا گیا۔ کوئی حکومت کسی جماعت کو نہ ترک مذہب پر مجبور کرسکتی ہے نہ ترک زبان پر، اور اگر اس نے ایسا نادانشمندانہ قدم اٹھایا تو نہ ملک کے تمام افراد متحد ہو سکتے ہیں اور نہ حقیقی معنی میں امن و سکون پیدا ہوسکتا ہے۔

## حلقۂ یارانِ نجد کی ایک کڑی اور ٹوٹ گئی

۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کی شام کو جب ۱۹۶۵ء کے شروع ہونے کو صرف چھ گھنٹے باقی تھے، ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی اپنے بیوی بچوں اور احباب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے اور اس طرح نگار کے حلقۂ یارانِ نجد کی ایک کڑی اور ٹوٹ گئی۔

مرحوم میرے ان چند احباب میں سے تھے جن کا بے پایاں خلوص صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بیان میں نہیں آسکتا - اب سے پورے پچاس سال پہلے بہ وساطت لطیف الدین احمد اکبر آبادی میں ان سے متعارف ہوا اور اس کے بعد ہی اس تعارف نے ایک مضبوط رشتۂ اخوت کی صورت اختیار کر لی، جو نہ کبھی ٹوٹا نہ کبھی اس میں گرہ پڑی - غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نگار لطیف اور ضیاء عباس ہی کی وجہ سے وجود میں آیا اور پھر مخمور اکبر آبادی کی سرگرمیوں نے اس کو پروان چڑھایا: اس کے بعد یاران نجد کے حلقے میں اور احباب بھی شامل ہو گئے اور ان کی تعداد سولہ تک پہنچ گئی - چالیس سال کا زمانہ کم نہیں ہوتا - لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ اس دوران میں نصف سے زیادہ احباب کی جدائی لازمی قرار پاتی، تاہم ہوا یہی اور اب آخر میں ڈاکٹر ضیاء عباس کے ساتھ اس حلقہ کی نویں کڑی بھی ٹوٹ گئی - اے دادِ من صد وادلِ من ——

مرحوم کی عمر کا سارا حصہ ریاست گوالیار میں صرف ہوا اور میں ۱۵ء سے ۲۶ء تک بھوپال میں رہا - لیکن یکجائی بھی گاہ گاہ ہو ہی جاتی تھی - کبھی آگرہ میں جو لطیف کی ذات اور مرحوم شاہ دلگیر کی دلچسپ شخصیت کی وجہ سے مرکز شعر و ادب بن گیا تھا کبھی بھوپال میں جسے ملک حبیب احمد خاں کی رومان آفریں ہستی نے بڑی دلچسپ کارگاہ حسن و الفت بنا دیا تھا اور کبھی خود لشکر (گوالیار) میں جو مرحوم کا مستقل مستقر تھا - اس زمانے کی دلچسپ و رنگین صحبتوں کا خیال جس وقت آجاتا ہے —— اور اکثر آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ سب بالکل جھوٹ تھا۔

ہر چند اس اجتماع میں انتشار تو ۲۶ء ہی سے شروع ہو گیا تھا جب میں بھوپال سے لکھنؤ چلا گیا، ملک حبیب احمد خاں نے بھی بھوپال چھوڑ دیا - لطیف نے اپنا کاروبار کلکتہ منتقل کر دیا شاہ دلگیر کا انتقال ہو گیا اور مخمور نے بھی آگرہ چھوڑ دیا - تاہم ضیائی کی وجہ سے لشکر ضرور مرکز نقل و کشش بنا رہا - لیکن جب ۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد لشکر میں بھی فتنہ و فساد شروع ہوا اور ضیائی کا مکان اور تمام سامان نذر آتش ہو گیا تو وہ خانماں برباد ہو کر بھوپال آگئے اور یہاں چند مہینے قیام کرنے کے بعد کراچی چلے آئے - لیکن نگار کی خدمت سے وہ کراچی آنے کے بعد بھی غافل نہیں رہے اور نگار کی اشاعت و فروخت کے لئے یہاں کی حکومت سے امپورٹ لائسنس بھی لے لیا اور ۶۱ء تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا - اس کے بعد ناگہاں آپ پر فالج کا حملہ ہوا - جس سے وہ جانبر تو ہو گئے لیکن نقل و حرکت کی قوت کھو بیٹھے - میں جب ۶۳ء میں یہاں آیا تو ان کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا - لیکن یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی کہ وہ بڑی پامردی و ہمت سے مرض کا مقابلہ کر رہے تھے اور میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ ممکن ہے کسی وقت نقل و حرکت کی قوت بھی عود کر آئے - لیکن ناگہاں دسمبر ۶۳ء کے آخری ہفتہ میں ان پر نمونیا کا حملہ ہوا اور بدقسمتی سے اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب اجل اپنا کام کر چکی تھی اور مجھے اس کا موقع بھی نہ ملا کہ آخر وقت میں ان سے کچھ باتیں کر لیتا -

بہر حال اب وہ وہاں ہیں - جہاں ہم سب کو جانا ہے اور اس خیال سے یک گونہ اطمینان بھی ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض دینوی سے فارغ ہو کر رخصت ہوئے - خدا اپنے جوار رحمت میں ان کو جگہ دے -

## ڈاکٹر فرمان فتحپوری

عزیزی فرمان فتحپوری نے جن کا نام نگار کے پہلے صفحہ پر ہر ماہ آپ کی نگاہ سے گزرتا ہوگا، اب ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی ہے اور مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ اپنی تعلیم کا سلسلہ انھوں نے بالکل میری ہدایت کے مطابق قائم رکھا - فرمان گریجویٹ ہونے کے بعد اول اول مدرسہ اسلامیہ فتحپور (میرے وطن) سے متعلق ہو گئے - لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی چلے آئے - یہاں پہنچ کر انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ آئندہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ قانون کی سند لے چکے ہیں اور وکالت کرنا چاہتے ہیں - میں نے ۲۹، جولائی ۵۲ء کو ان کے خط کے

جواب نہیں لکھا کہ " وکالت کو ٹالئے جہاں تک ٹل سکتی ہے - آپ تو امتیاز کے ساتھ بی ٹی - ایم اے - اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیجئے تاکہ محکمہ تعلیم میں آپ کو اچھی جگہ مل سکے "

چنانچہ انھوں نے حرف بہ حرف میری ہدایت پر عمل کیا اور ان تمام درمیانی مراحل سے گزرنے کے بعد آخر کار انھوں نے اس سال کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی جہاں وہ کئی سال سے استاد اردو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں وہ مقالہ جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے - اس کا عنوان " اردو کی منظوم داستانیں " تھا اور یہ مقالہ انھوں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رہبری و نگرانی میں مرتب کیا جو یہاں شعبۂ اردو کے صدر ہیں اور زبان و ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں -

ڈاکٹر فرمان نے اس دوران میں صرف اپنا مقالہ ہی مرتب نہیں کیا بلکہ کئی مفید کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں

(۱) تدریس اردو (۲) تحقیق و تنقید (۳) اردو رباعی شائع ہو چکی ہیں -

میرے یہاں آنے کے بعد انھوں نے نگار کی بھی بڑی اہم خدمات انجام دیں - چنانچہ نیاز نمبر کے دونوں حصوں کی ترتیب محض انھیں کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اور سالنامہ " تذکرہ نمبر " تو خیر پورا کا پورا انھیں کا مرتب کیا ہوا ہے -

فرمان میرے ہموطن ہیں ، میرے عزیز ہیں ، مجھ سے بہت چھوٹے ہیں ، اس لئے میری طرف سے اظہار شکریہ کا تو کوئی موقع نہیں دعا کا ضرور ہے - سو اس کا تعلق بھی دل سے ہے زبان سے نہیں !


# مومن نمبر

## نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

مرتبہ

## نیاز فتحپوری

**مومن** اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی ، اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے - یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہل ذوق کے لئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ

**مومن نمبر کے مطالعہ سے ہوگا**

اس نمبر میں مومن کی سوانح حیات معاشقہ ، اس کی غزل گوئی - قصیدہ نگاری ، مثنویات و رباعیات اور خصوصیات کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے ، کوئی کتاب ، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے -

قیمت : چار روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

# ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستان کی مدح

(گزشتہ سے پیوستہ)

صباح الدین عبدالرحمٰن

آگے چل کر ہندوستان کے فارسی شعراء میں فیضی (المتوفی ۱۵۹۵ء) کو ہندوستان کی ہر چیز سے عشق رہا جس کا ثبوت اس نے لیلاوتی جیسی خشک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے دیا۔ پھر یوگ وشسٹ، بھگوت گیتا اور پران میں ہندوؤں کے جو فلسفیانہ خیالات ہیں ان کو ایک رسالہ شارق المعرفت میں منتقل کیا۔ اسی طرح سومدیو کی کہانیوں کے مجموعہ کتھا سرت ساگر کو فارسی دانوں میں فارسی زبان کے ذریعہ سے روشناس کیا اور آخر میں اپنی معرکۃ الآرا مثنوی نل دمن لکھی جس کے متعلق فیضی کے سب سے بڑے نکتہ چیں ملا عبدالقادر بدایونی کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ اس قسم کی کتاب تین سو سال کے اندر نہیں لکھی گئی۔ خود فیضی کو یہ مثنوی لکھتے وقت ایک خاص لذت محسوس ہوئی۔ کہتا ہے کہ اس پرانے قصے کو لکھ کر وہ بزم عشاق میں ناز و نیاز کے سینکڑوں تحفے پیش کر رہا ہے۔ جس کو پڑھ کر لوگ محسوس کریں گے کہ اس سرزمین (ہندوستان) میں عشق و عاشقی کے سرمست عشق کی راہ میں دل و جگر برباد کر کے کس طرح آتش عشق کے خاکستر بن کر رہ گئے ہیں۔

نو ساز فسانۂ کہن را     عشق نل و خوبی دمن را
از ناز و نیاز ایں دو مشتاق     صد تحفہ ببر بزم عشاق
در ہند بہ بیں کہ عشق چوں بود     دلہا بچہ دشنہ غرق خوں بود
زین خاک چگونہ عشق بازاں     رفتند دل و جگر گدازاں
آتش زدہ خود بخود گشتند     خاکستر دہر عشق گشتند

پھر کہتا ہے کہ وہ بت و برہمن کی شرح بیان کر کے ایک نیا آتشکدہ تیار کر رہا ہے۔ ایک نیا دیر بنا رہا ہے۔ زمانہ کی گردن میں زنار ڈال رہا ہے۔ یہ ایک ساز سے فلک کے ناقوس کو پُرآواز کر رہا ہے۔

آتش کدۂ نو کنم طرح     عشق بت و برہمن ہم شرح
دیری بکشم دریں خرابہ     کیں نامہ شود برو کتابہ
زیں خط فگنم برہمنانہ     زنار بگردن زمانہ
ہر زخمہ کہ بر زنم بریں ساز     ناقوس فلک کنم پرآواز

آگے چل کر کہتا ہے کہ ہندوستان میں جیسا جذبۂ عشق ہوتا ہے۔ کہیں اور نہیں ہوتا۔ اس کی خاک پا کا ذرہ ذرہ آفتاب ہے اور ہر ذرہ نہ سپہر کا چراغ ہے۔ یہاں کے عشق کی زیادہ گرمی ہی کی وجہ سے یہاں کے آفتاب میں گرمی زیادہ ہوتی ہے۔

ہنداست و ہزار عالم عشق     ہندست و جہان جہان غم عشق
بے نقش وفا خط جبیں نیست     بے رنگ جگر گل زمیں نیست

خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہرست     ہر ذرہ چراغ نہ سپہرست
ایں شعلہ ہند گرم خیزست     اینجاست کہ آفتاب تیزست
عشق عرب و عجم شنیدم     از ہند بگویم آنچہ دیدم

فیضی اکبر کے ساتھ اس کے چونتیسویں سال جلوس ۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء میں کشمیر گیا تو اس کی رعنائی اور دل آویزی دیکھ کر مست ہوگیا، اور ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں وہ لکھتا ہے کہ اس کی ہوا میں ایک نقاش کی خیال آرائی کا تنوع ہے۔ اس کی سرزمین میں صفحۂ تصویر کی رنگا رنگی ہے۔ اس کی فطری بوقلمونی اور نقاشی کارخانۂ قدرت کے عجائب میں سے ہیں۔ اس کا غبار آنکھوں کی دوا ہے اور اس کی گھاس روح کے لئے اکسیر ہے۔ اس کا پانی بدن کے لئے ایسا ہے جیسے گلاب اور اس کی شراب ہو، اور اس کی ہوا روح کے لئے ایسی ہی جیسے دودھ کے لئے شکر ہو۔ اس کی نسیم سحری کے سامنے دم عیسیٰ بھی مسموم ہے۔ اس کے آب رواں کے نزدیک زلال خضر بھی تالاب کا محض جما پانی ہے اس کے پانی کی آواز میں ارغنوں کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اس کی صندلی زمین کافوری برف سے نم رہتی ہے۔ اور اس میں گلاب وعبیر کی بھی آمیزش ہے۔ یہاں گھاس کے بجائے زعفران ہوتا ہے کہ اس کی مٹی میں بھی تاثیر ہے۔ قدرت کی فیاضی سے یہاں ہزاروں چشمے اُبلتے رہتے ہیں اور ہر جگہ قدرتِ ازلی کی صناعی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے انگور کی یہاں بڑی کثرت ہے۔ سیب کی خوشبو سے روح تازہ ہوجاتی ہے اور انار کی خوشبو سے فرحت ہوتی ہے۔ انجیر بھی بہت ہیں اور یہاں کے میوؤں اور پھولوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مشک بھرے ہرنوں کے جلوے بھی یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس قصیدے کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

ہزار قافلۂ شوق می کند شب گیر     کہ بار عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصہ کہ دیدن او     ورق نگار خیال است و نقشبند ضمیر
ہوائے او متنوع چو فکرتِ نقاش     زمین او متلون چو صفحۂ تصویر
غبار او بتواں خواند چشم را دارو     گیاہ او بتواں گفت روح را اکسیر
بتن موافقت آب او چو بادہ و گل     بجان مناسبت باد او چو شکر و شیر
بہ پیش فیض نسیمش دم مسیح سموم     بہ نزد آب روانش زلال خضر غدیر
گرد بمیکدۂ عشق خانقاہ ورع     بدل بہ نعرۂ مستانہ سبحۂ تذکیر
غریو کوس ز جوش و خروش مے ایما     صدائے آب ز آواز ارغنوں تعبیر
ز ہوش می برد اللہ اکبر ایں چہ صداست     فداش نعرۂ تہلیل و غلغل تکبیر
فصول او ہمہ تشابہ ز اعتدال ہوا     بہم یکے دی و اردی بہشت و بہمن و تیر
زمین صندلیش نم ز برف کافوری     بیاد دادہ ز آمیزش گلاب و عبیر
نسیم او ز سر آب تیز می گذرد     کہ بادرا نتواں داشت پائے در زنجیر
ز سر جواں شود اریک نسیم صبحدمش     گنند قسمت بزجزد جزدِ عالم پیر
درد بجائے گیا زعفرانِ ہمی روید     کہ آب و خاک طرب را چنیں بود تاثیر
بہر طرف روی ز بحر فیض مالامال     ہزار چشمہ جوشندہ چوں دل تحریر

زاعتدال ہوائش شگفت نیست شگفت — کہ سر زند ہمہ عناب از نہال زریر
بجیرتم کہ چہ آثار قدرت ازلی ست — بہر نظارہ بتازد نظر بصنع قدیر
دریں دیار مغنی ترانہ ساز مکن — بس است از لب مرغان نغمہ سنج صفیر
شراب خوردہ حریفاں بجائے آب درد — کہ تشنگان ہوس ماہی برد تدبیر
خراب آں مے بے غش شوم کہ ہست چو عشق — بہ عقل درتگ و تاز و بصبر در نرد گیر
بعینہ زر محلول آیدت بنظر — اگر از دگلنی قطرہ بچشمہ قبیر
اگر دماغ لطافت شود گلاب طلب — کنند از تف ایں بادہ برگ گل تقطیر
خروج کردہ عنب درچمن سپاہ سپاہ — کش از میاں فواکہ گرفتہ اند امیر
شمیم سیب دہد مغز روح را تطیب — نسیم بر فگند طبع ذوق در تعطیر
پسند نیست مگر یکدلش چو من در عشق — کہ با ہزار دل آمد دریں چمن انجیر
بعجز معترفم در شمار میوہ و گل — کہ ہست بر قد معنی لباس حرف قصیر
بجلوہائے قریب آہوان مشکینش — کشیدہ شیر دلان را بدام عشق اسیر
زبسکہ مست کند نکہت ریاحینش — کند دست حمایل بگردن نخچیر

اکبری عہد کے شاعر عرفی (المتوفی ۱۵۹۰ء) نے دل کھول کر کشمیر کی تعریف کی کہ کشمیر آکر سوختہ جان بھی تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ہواؤں میں کچھ ایسی لطافت ہے کہ چاشت کی ہوا بھی نسیم سحری معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کشمیر کے دروازہ پر آگئی ہو، کشمیر کی رعنائی سے زال فلک میں بھی عشوہ گری آگئی ہے۔ یہاں کے سبزے، چشمے، لالہ و گل کی شرح کرنا آسان نہیں۔ یہاں لالہ کی پیداوار اتنی ہے کہ پتھر اور تیشے کے منھ سے بھی لالے ہی نکلتے ہیں۔ کشمیر میں اتنی طراوٹ اور رطوبت ہے کہ گرد و غبار بھی شبنم بن جاتی ہے۔ کشمیر کی رنگا رنگی طاؤس ایسی ہے اور جمال دلھن کی طرح ہے۔ کشمیر ایک بہشت ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید — گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید
بنگر کہ ز فیضش چہ شود گوہر یکتا — جانے کہ خزف گردد و آنجا کہ گر آید
وآنگہ بچنیں فصل کہ در ساحت گلزار — از لطف ہوا چاشت نسیم سحر آید
از بلبل خاموش دل باغ گرفت است — ادراچہ گنہ محمل گل دیر تر آید
گل ہم چہ کند باد صبا خواست کہ عرفی — آید سوئے کشمیر و گلشن بر اثر آید
ناشگفتہ گل اما بشل برگ شاخے — گر پائے نہم خون گلم تا کمر آید
فردوس بدروازہ کشمیر رسید است — کو مدعی گر نگہ مژدہ است در آید
زیبائی کشمیر گرش باعث عشوہ ست — من می خرم از زال فلک عشوہ گر آید
ایں سبزہ و ایں چشمہ و ایں لالہ و ایں گل — آں شرح ندارد کہ بگفتار در آید
آں چشمہ کہ رضواں چو رود تشنہ لبو یش — کوثر لبرش تیز ترد تشنہ تر آید
آں لالہ کہ ہنگام تراشیدن خارا — از رخنۂ سنگ و دہن تیشہ بر آید

کشمیر بہشتی است فریبندہ کہ شبلی      آید چو در صومعہ بردے سقر آید
طاؤس مثالی کہ برافشاندہ پروبال      ہر لحہ برنگ دگر اندر نظر آید
زیبندہ عروسی کہ بیفزودہ جمالش      ہر دم بنظر خوشتر و شاداب تر آید

شاہ جہاں کے دربار کے ملک الشعراء حاجی جان محمد قدسی نے بھی کشمیر کی رعنائی سے متاثر ہوکر اشعار کہے جن میں وہ کشمیر جنت نظیر کے سبزہ زاروں اور پھولوں کی تعریف کے ساتھ وہاں کی آب وہوا کی مدح سرائی اس طرح کرتا ہے۔

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر      کہ سر بر زد بہشت از خاک کشمیر
سوادش سرمۂ چشم بہار است      بہشت و جوی شیرش آب لار است
زجوش سبزہ در کوہ و بیابان      زمین کشتہ و ناکشتہ یکسان
جز آں گلہا کہ مشہور جہانست      گل ایں جا بوستاں در بوستانست
کند و ربذل عمر جاودانی      ہوایش کا آب زندگانی
بزیر سبزہ و در کوہ و صحرا      چو از عقد زمرد رشتہ پیدا
بود مایل بسبزی خاک پاکش      مگر آب زمرد خوردہ خاکش
زفیض ابر می روید دریں کاخ      ز تار شمع گل بیش از رگ شاخ
کند گل بر سر دیوار ریشہ      شود فولاد سبز از آب تیشہ
نگاری بر ورق گر صورت خار      ز تاثیر ہوا گل آورد بار
گر افتد از کف ساقی پیالہ      دواند ریشہ در گل ہمچو لالہ
بمینا گر کند فیض ہوا کار      ببالد چوں کدوی تازہ بر تار

شاہ جہاں کے درباری مورخ عبدالحمید لاہوری (المتوفی ۱۰۶۵ھ) نے اپنی تاریخ بادشاہ نامہ میں کشمیر کی دل آویزیوں کا ذکر بہت ہی انشا پردازانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ سری نگر کے ڈل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں درختوں، پھولوں اور سبزہ زاروں کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرش زمردیں اور ایک بساط رنگیں بچھی ہوئی ہے۔ ان کا عکس پانی میں پڑتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ؎

بہشتی از تہ دریا نمودار      چناں کز دیدۂ تر عکس دلدار
چمنہا در میان آب پیدا      چو روی نوخطاں از دیدۂ ما
بہشت است آنکہ تا کشمیر را دید      بسر از شرمش بزیر آب زر دید

شاہ جہانی عہد کا مشہور منصب دار ظفر خاں احسن کشمیر کا حاکم مقرر ہوا تو وہ خود بھی ایک شاعر تھا۔ اس لئے اس نے کشمیر پر ایک مثنوی لکھی جس میں یہاں کے تنبولی، بقال، عطار درکانے والوں کے علاوہ پھولوں، مولسری، کیوڑہ، گلنار، بیل، جوہی کنول۔ پھلوں میں کٹھل، کمرک، فالسہ، بیر، جامن، کیلا اور پان۔ پرندوں میں طوطے، مینا، کوئل اور پپیہے کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے ؎

ز تنبولی و از بقال عطار      بسر گرم است در ہر کوچہ بازار
زنے مشکل کہ خیزد دیگر آہنگ      ز رشک بانسلی دارد دل تنگ

کما نچہ ہم ازیں حلقہ بجستہ      زتیر طعن سارنگی ست خستہ

پکاوج گشت تا با دھلکی ساز      تباں را گرم شد ہنگامۂ ناز

نہال بولسری آں زیب گلشن      کز دگل می تواں بردن بجز من

زگلہا کیورہ گردید ممتاز      در دپیچیدہ بوچوں نغمۂ رساز

شگفتہ آنچناں گل ہائے کچنار      کہ گوئی آتش افتادہ بہ گلزار

زکنہل دیدہ تا رنگ اصالت      بود در رنگریزی از خجالت

زجوش بیل واز جوہی دجاہی      نگہ را می شود گشتی تباہی

زطوطی وز مینا و ز کویل      زہر یک آنکہ آہنگس برد دل

زکرک بزم مستاں گشت روشن      ز شمع او گلستاں گشتہ روشن

بوداز پالسہ و ز بیر د جامن      بہ گلشن باغباں را چشم روشن

زکیلہ چوں بہ تقریبی سر دم      بود بر روح افیونی دم

زوصف پان کنم رنگین سخن را      کہ نامش می کند رنگیں دہن را

گرفتہ یک قلم اقلیم دل را      جہاں گیری مسلم شد کنول را

شاہجہانی دور کے شعرا میں مرزا محمد طاہر آشنا ظفر خاں حاکم کشمیر کا بیٹا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کو اپنا ندیم خاص بنا رکھا تھا۔ وہ شاہی کتب خانہ کا داروغہ مقرر ہوا۔ اس نے اپنی عمر کا آخر حصہ کشمیر میں گزارا۔ جہاں کی رعنائیوں سے محظوظ ہو کر ایک مثنوی بھی لکھی۔ شاہ جہاں کے دربار کا ایک شاعر میر صیدی طہرانی بھی تھا جو اپنی شاعری کی نازک خیالی اور بلندیٔ فکر کے لئے مشہور تھا اس نے بھی کشمیر پر ایک مثنوی لکھی۔ داراشکوہ کے مرشد ملا شاہ شاعر بھی تھے۔ پہلے لاہور میں سکونت پذیر تھے۔ آخر میں کشمیر میں رہنے لگے۔ انھوں نے فارسی میں کئی مثنویاں لکھی ہیں جن میں ایک رسالہ تعریفات خانہا و باغہا و منازل کشمیر ہے۔ اس میں اپنی قیام گاہ کے علاوہ کشمیر کے پھلوں، پھولوں، باغوں کے ساتھ دنتی پور، بجرارہ، اینچ، بادل ادیدی ناگ، کوثر ناگ۔ وہرا اور دیولاخ وغیرہ جیسی دل پذیر جگہوں کی بھی تعریف کی ہے۔ پھر اپنی ایک دوسری مثنوی رسالہ نسبت میں ہندوستانی پھولوں میں گل سنجد، گل گلاب، گل انگور، گل رعنا، گل زیبا، نسرین، یاسمن، نرگس، بنفشہ، نسترن، گل تاج، خروس گل جعفری، گل عباسی، گل زعفران، گل داؤدی، گل نیلوفر اور گل دیوراج وغیرہ کی تعریف کی ہے۔

کشمیر نے ہندوستان سے باہر کے فارسی شعراء کو بھی اپنی طرف مائل کیا ہے۔ حافظ شیرازی کو سیہ چشمان کشمیری کی یاد برابر آتی رہی۔ اس لئے کہتے ہیں ؎

بشعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

جامی نے بھی کشمیر کو رشک فردوس بریں کہا ہے۔

یکے گفتا کہ در اقصائے کشمیر      ز شیرینی نباشد ہیچ تقصیر

مقام خوبرویاں آں زمین است      بخوبی رشک فردوس برین است

ہندوستان کے مختلف مقامات نے ان فارسی شعراء کو لبھایا اور جن خطوں سے محبت پیدا ہوئی۔ ان سے اپنی شاعری میں والہانہ لگاؤ کا اظہار کرتے رہے۔ مثلاً شاہ جہاں کے دربار کے ملک الشعراء ابو طالب کلیم (المتوفی ۱۰۶۱ھ) کو اکبر آباد (آگرہ) بہت پسند تھا۔ ۔ ۔ اس لئے اس کی تعریف میں ایک پورا قصیدہ لکھا ہے جس کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

خوشا ہندوستاں مادائے عشرت      سوادِ اعظم اقلیم راحت
ز خاک پاک او برداشتن کام      چناں آساں کہ بردارد کسے کام
متاع خاطر جمع و دل شاد      بسے ارزاں بود در اکبر آباد
سوادش مشق کردہ تختۂ خاک      وزاں تختہ سبق خوانست افلاک
ہزاراں مصر در ہر کوچہ اش گم      چو نیلش رود ہائے پر تلاطم

اس کے بعد اکبر آباد کے محلوں اور عمارتوں کا ذکر کرتا ہے۔ حسن میں اس کے یہاں کے مطابق سنگ خارا پر ایسی تزئین کاری کی گئی تھی کہ ان میں نقش شیریں اور روح فرہاد نظر آتی تھی ؎

بناہا سر بسر ز سنگ خارا      ز ہر سنگے ہنرہا آشکارا
ز نقش تیشہا بر صفحہ سنگ      سراسر کوچہا پر نقش ارژنگ
ز صورت بس کہ دارد سنگ تزئین      نماید بے ستون و نقش شیریں
بپائے ہر بنائے اکبر آباد      بہ یک پا ایستادہ روح فرہاد

وہ اکبر آباد کے بازاروں کی تصویر کھینچتا ہے تو وہاں کے خوبان گل اندام کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ وہاں کے بزاز کی دلبری، صراف کی عشوہ گری، تنبولی کی دل کشی اور دھوبی کے حسن شستہ سے بہت لطف اور محظوظ ہوتا ہے۔

بہ بازارش ز خوبانِ گل اندام      شگفتہ گلبنی بینی بہر گام
قماش دلبری بزاز دارد      کہ بر دیبائے چینی ناز دارد
بت صراف با صد عشوہ و ناز      بہ نقد قلب ما کے بنگرد باز
بہ پیش روئے او از جنبشِ زر      نیاید مشتری اندر برابر
بہ ایں مغرور زر عاشق چہ سازد      بایں برحق کدامیں حیلہ بازد
ز تنبولی و لے دارم ہمہ ریش      زغم پیچیدہ ہیچو پرہ بر خویش
منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل      کہ خبر خوں خوردن از وے نیست حاصل
ز حسن شستۂ دھوبی چہ گویم      ازاں بے پردہ محبوبے چہ گویم

وہ اکبر آباد کے حسین باغوں کے رنگین پھولوں کا ذکر بھی پر کیف طریقہ پر کرتا ہے۔ مثلاً ؎

چہ چنپہ شعلہ شمع است بے دود      کہ آتش می زند در خرمن عود
ز موزونان نظر در یوزہ دارم      کہ وصف مولسری را بہ نگارم
گل گڑہل نہ فہمید است موسم      شگفتہ چو رخ یار است دائم

کلیم کو ہندوستان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ ایک بار اس کو اپنے عزیزوں کے ساتھ ایران جانا پڑا تو روتا دھوتا گیا

اور ہندوستان کی یاد میں مُرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

اسیرِ ہندم و زیں رفتنِ بیجا پشیمانم
کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغِ بسمل را

بہ ایراں می رود نالاں کلیم از شوقِ ہمراہان
بپائے دیگراں ہمچو جرس طے کردہ منزل را

ز شوقِ ہند زاں ساں چشمِ حسرت بر قفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

اور جن شعراء نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا، لیکن یہاں آکر کچھ دنوں مقیم رہے تو ان کو بھی اس سرزمین کا راگ الاپنا پڑا۔ مثلاً ایرانی شاعروں میں علی قلی سلیم (المتوفی ۱۶۴۷ء) کہتا ہے کہ ایران میں تحصیلِ کمال کا سامان نہیں ہے۔ حنا ہندوستان ہی میں جاکر رنگین ہوتی ہے ؎

نیست در ایران زمیں سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سوئے ہندوستاں حنا رنگیں نہ شد

اسی طرح دانش مشہدی بھی کہتا ہے ؎

راہ دورِ ہند پابستِ وطن دارد مرا
چوں حنا شب درمیاں رفتن بہندوستاں خوش است

میرزا صاحب کچھ دنوں ہندوستان میں رہا لیکن پھر ایران واپس چلا گیا اور آخیر زندگی تک ایران سے باہر نہیں نکلا۔ تاہم ہندوستان کی یاد اس کو برابر ستاتی رہی ؎

ہچو عزمِ سفرِ ہند کہ در ہر دل ہست
رفتن سودلئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

بعض شعراء کے کلام میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی محبت پر بہت سے اشعار ملیں گے۔ مثلاً ملا محمد صوفی (المتوفی ۱۶۲۵ء) مازندراں کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ اکبر کے زمانے میں اپنے وطن ہندوستان آئے اور گجرات جاکر سورت میں متوطن ہوئے، گجرات اور سورت کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

بہ گجرات آرزو باخود مبر دل　　　کہ آنجا دل ربا بیش از شمار است
مقرمن ازاں شد شہرِ سورت　　　کہ دانستم کہ ایں دار القرار است
جمال ایں جاندار د باد فاجنگ　　　صباحت با ملاحت تیز یار است

داراشکوہ کے مرشد ملا شاہ کی مثنوی نسبت کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اس میں کشمیر، لاہور، ملتان، پٹن، سندھ، دہلی، اجمیر، اکبرآباد، احمدآباد، دکن اور بنگال کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ہر جگہ کی خصوصیت نمایاں ہو جاتی ہے تلمیحات کی طرف ناظرین کا ذہن خود منتقل ہو جائے گا ؎

دلم افتاد جانبِ کشمیر　　　ہفت وحشتش بہشت عشرِ عشیر
روم از شوق جانبِ لاہور　　　کہ در آنجا میانست معدنِ نور

دہ چہ ملتان نرفتہ زیر زمیں — آفتاب یقین بہاؤ الدین
چہ تپن ہاست زیر خاک نہاں — کہ فرید است آفتاب آں
درزمیں سند ہاستہ بہ نہفتہ — از میاں تا میاں گل اشگفتہ
شاہ راعطر گل جہاں گیر است — تازہ او از گل میاں میر است
ماکہ درمنہ روئے مہ دیدیم — آفتابی کہ بودہ رہ دیدیم
مطلع آفتاب سند بود — خانۂ آفتاب ہند بود
درزمیں دہلی ہائے پنہانند — کہ نظامی و خسروش دانند
زمیاں تا کہ یافتہ ماہ یقیں — خفتہ آنجا ہزار قطب الدین
دگرم باز میل اجمیر است — کہ بخوبی نظیر کشمیر است
رہ چہ اجمیر پاستہ زیر زمیں — منزل آفتاب شیخ معین
اکبر آباد شہر نیک طراز — ہست اللہ اکبر ایں شیراز
احمد آباد باشندہ گلہا — شاہ عالم در او ست عالمہا
خفتہا دکن سند و بنگالہ — ہمہ محبوب چاردہ سالہ

ابوالبرکات منیر لاہوری (المتوفی ۱۰۵۴ھ - ۱۶۴۴ء) نے بنگال پر ایک مثنوی لکھی۔ جس میں ہندوستانی پھولوں میں چنبیلی رائے بیل، نسترن، سیوتی، رائے چنبہ، کیوڑہ، جوہی، جاہی۔ چنبہ وغیرہ اور پھلوں میں کیلا، بہل اور کمرک وغیرہ کی تعریف

جعفر بیگ بینش کشمیری شاہجہانی عہد کا شاعر تھا۔ اورنگ زیب کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں وفات پائی۔ اس نے بہت سی مثنویاں لکھیں۔ اس کا وطن تو کشمیر تھا۔ لیکن اپنی مثنوی بینش البصار میں دہلی کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ دہلی کی ایسی رنگ کسی شہر میں نہیں پائی جاتی ہے ؎

دہر بود گلشن خوش رنگ و بو — شہر وہ از تازہ نہالان او
سرو در بن باغ بود کوہسار — شبنم او بحر بود گل دیار
برگ گلے دست زبستان او — زرد بود طرح خیابان او
چہرہ یک قطعہ دریں بوستاں — نیست بسر سبزی ہندوستاں
بوتہ ربسیار خوش ایں چمن — نیست بجز دہلی گل پیرہن
شہرہ بخوبی بہمہ شہرہاست — شہر بہ نگینیٔ دہلی کجا است

پھر یہاں کے لوگوں کی سیرت، عقل، صداقت پسندی، حسن اور وفا کیشی کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

او ست زار بار صفا سے بدل — ہمچو صدف مشت گہر در بغل
دانش[۱] قومش از بسکہ پسندیدہ اند — خوب تراز مردمک دیدہ اند
ہست[۲] دو راستہ بازار ہا — راستی آموز خریدار ہا

۱ہ ۔ ۲ہ اصل اسی طرح ہے۔

لالہ رخانش ہمہ خوش خط و خال — ہوش ربا چوں شفق برشکال
نیست بہ گلزار خوش آوازگی — شہر بایں کہنگی و تازگی
بسکہ بر داز برساتش اثر — بگذرد در دشت سبزہ چو کاکل زسر
مردو زنش لبک و فا پرورند — بہر غریباں پدر و مادر اند

پھر دریائے جمنا، حضرت شیخ نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی مدح سرائی ہے۔

بنیش کشمیری کی دوسری مثنوی "گلدستہ" میں پنجاب کی ستائش بڑی بلند آہنگی سے کی گئی ہے۔

پنجاب بود سواد اعظم — خالیست بطرف روئے عالم
پنجاب امیر ہر دیار است — اے بندۂ او چو شہریار است
پنجاب ولایتے است مشہور — ہر پرگنہ اش چو مصر مشہور
پنجاب بزرگ و دہر کوچک — او پیر است و زمانہ کودک
پنجاب بود رئیس عالم — دیہے است جہاں دار مقدم؟
پنجاب اگر بہشت خوانش — چو خلد نکو سرشت خوانش
پنجاب سراست و تن بود ہند — جان پنجاب و بدن بود ہند
پنجاب چو سرزمین ماہست — خاک سیہ اش بدینگاہست

اس کے بعد لاہور کا ذکر ہے۔ بینش کی ایک تیسری مثنوی گنج رواں میں بنارس کی تعریف ہے جس میں وہاں کے عشق و محبت سے بھرے ہوئے مردوں، عورتوں اور خوبصورت برہمن زادوں کی خوبیوں کو بیان کر کے کہا گیا ہے کہ ہندوستان گلستان ہے تو بنارس سنبلستان ہے اور یہاں کفر و ایمان ہمراز بن گیا ہے۔

بنارس را عجب آب و ہوائیست — برائے عشق بازی طرفہ جائیست
زن و مرد از محبت گشتہ مفتوں — چو زلف لیلے و زنجیر مجنوں
کف خاکے کہ باآں سرزمین است — چو پشت دست خوباں دلنشین است
بنائش از نمک نیکو سرشتند — کہ موج سبزۂ باغ بہشتند
برہمن زادگان فتنہ آئیں — چو گل دارند زر برجامہ برچیں
بود بازار ہا تیغ کشیدہ — برد سبزہ چو جوہر آرمیدہ
ز وصل خود سراسر گل فروشند — ہمہ ہمچوں صدف گوہر بگوشند
ہمہ سبزاں چو صبح فیض تاثیر — نمک پروردۂ حسن جہاں گیر
شد آں روزے کہ ہندوستاں گلستان — ز سبزاں شد بنارس سنبلستان
سیاہش از نمک چوں سبزہ سرشار — سفیدش را بود شور نمک زار
دریں کشور کہ از عشق فسوں ساز — بہم کفر و مسلمانیست ہمراز

علی حزیں (المتوفی ۱۷۵۹ء) نے بنارس کی تعریف تو بہت ہی اچھوتے انداز میں کی۔ وہ کہتے ہیں ؎

# معائبِ شاعری

رشید حسن خاں

معائبِ شاعری کے کئی قاعدوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ بعض قاعدوں کو کسی زمانے میں قبولِ عام کی سند نہیں ملی۔ کچھ ضابطے ایسے ہیں جن کو لوگوں نے مناسب مانا، لیکن کم سے کم لوگ ان کی پابندی کر سکے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ جن اساتذہ نے ان قاعدوں کو بنایا، یا ان کی پابندی پر زور دیا، انھوں نے ضرورت یا چلن کے بجائے، فارسی کی تقلید اور دبستانی مفروضات کو پیشِ نظر رکھا۔ کچھ قاعدے محض ذاتی پسند وناپسند کے آئینہ دار ہیں۔ اس زمانے میں کچھ لوگوں کا کام باقاعدہ، بامحاورہ، بارعایت شعر کہنا، بلکہ شعر بنانا تھا، اس لیے طرح طرح کی دقت پسندیاں، مذاقِ مشکل پسندی کو خوب راس آتی تھیں۔ ان لوگوں نے دائرہ شاعری کو اپنے لیئے چند اصناف تک محدود کر لیا تھا۔ اس بنا پر زیادہ پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جن مقامات پر ہم عصر اساتذہ کا اجتماع ہو گیا تھا، (جیسے رام پور، میں بعہد کلب علی خاں) وہاں ایسی پابندیوں اور موشگافیوں کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملتا تھا۔

بعض استاد، انفرادیت یا کمالِ استادی کے اظہار کے لیے، کچھ مفروضات کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کر لیتے تھے۔ جیسے بعض اساتذہ نے اس کا التزام کیا تھا کہ آسمان، جان کی قسم کے الفاظ کو بحالت مفرد، بہ اعلانِ نون ہی نظم کیا جائے۔ منیرؔ بھی اس قاعدے کو مانتے تھے۔ ایک جگہ بہت مجبور ہو کر کہتے ہیں ؎

منیرؔ افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت سے
نہیں تو لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا!

(کلیات ص ۲۲۶)

محترمی حضرت اثرؔ لکھنوی نے ایک اور دلچسپ روایت لکھی ہے:۔

"منیرؔ شکوہ آبادی شاگردِ ناسخؔ نے ایک مطلع کہا۔ بار ہا پڑھتے تھے اور کہتے تھے ہائے خوب مطلع ہے، مگر دیوان میں نہیں رکھ سکتا، کیونکہ آسماں بے عطف و اضافت نظم ہوا ہے۔ تاہم اعلان نون نہیں ہوتا۔ ؎

گنبدِ قبرِ دوستاں ٹوٹے،
اے زمیں تجھ پہ آسماں ٹوٹے

(رسالہ الحمرا لاہور۔ مارچ ۱۹۵۵ء)

ایسی پابندیاں محض لزوم مالا یلزم کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے یہ قایم نہیں رہ سکتی تھیں نہ رہیں۔ فنِ شاعری کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ خون، جان، دین، کی قسم کے الفاظ جب بہ عطف و اضافت آئیں، تو ان میں نون کا اعلان درست نہیں، لیکن اساتذۂ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے یہاں اعلان نون کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

امیر مینائی نے اپنے ایک شاگرد کو، جس کے ایک شعر میں لفظ سیہ بختی کی ی ساقط ہوگئی تھی، متنبہ کیا ہے "سیہ بختی میں یائے تحتانی کا اسقاطہ ہونا چاہیے" (مکاتیب امیر مینائی۔ مکتوب بنام کوثر خیرآبادی، لیکن خود ان کے دواوین میں عربی فارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علتِ معروف کی سو دو سو مثالیں بہ آسانی مل جائیں گی ـــــ منیر شکوہ آبادی کا مسلک اخفا و اعلانِ نون کے بارے میں سب کو معلوم ہے ابھی اس کا ذکر بھی آچکا ہے۔ یہی منیر انتہائے مجبوری کے عالم میں لکھتے ہیں۔

"دیک دو لفظ مثل جہاں، بہ اخفای نون واشباہا کہ در بعض مادۂ تاریخ بہ نظرِ ضیق مقام معتمداً آوردہ ام، معذور م دارند"

(کلیاتِ منیر ص ۷)

ہمارے زمانے کے اساتذہ میں حضرت اثر لکھنوی، ایطا کو من جملہ معائب مانتے ہیں۔ فراق پر اعتراض بھی کیا ہے۔ موصوف نے غزلوں میں حتی الامکان اس کی پابندی بھی کی ہے، لیکن اُن کے منظوم ترجمۂ گیتا، نغمۂ جاوید میں، ایطائے جلی کی خاصی مثالیں موجود ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس قبیل کی غیر ضروری پابندیاں بہت سے ان حضرات سے بھی نہیں نبھائی جا سکیں، جنھوں نے ان کی باضابطہ تائید کی۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے جیسے تیسے غزلوں میں ان کو ایک حد تک نبھا بھی لیا، لیکن جب انھوں نے تنگنائے غزل سے نکل کر، مثنویات وغیرہ کے کوچے میں قدم رکھا، تو یہ مفروضات ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔

متعدد قاعدے، بے ضرورت پابندیوں کی وجہ سے غیر ضروری تفصیلات کا مجموعہ، بلکہ گورکھ دھندا بن کر رہ گئے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ قاعدے کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، جن کا سمجھنا اور یاد رکھنا، ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ نہ ان کی مکمل پابندی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان قاعدوں پر نظرِ ثانی کی جائے، غیر ضروری پابندیوں اور خواہ مخواہ کے اُلجھاووں کو ختم کر دیا جائے تو اس سے دو بڑے فائدے ہونگے۔

ایک تو یہ کہ بہت سے اختلاف خود بہ خود ختم ہو جائیں گے ـــــ دوسرے یہ کہ ان کو سمجھنا آسان ہوگا اور ان کی پابندی بھی ہو سکے گی جن پابندیوں کا تعلق کچھ استادوں کی ذاتی پسند و ناپسند یا صرف، خاندانی احترام سے ہے، اور ان کی لازمی پابندی حسنِ کلام کے نقطۂ نظر سے ناگزیر نہیں، ان کو سرے سے ختم ہو جانا چاہیے۔

اس ذیل میں سقوطِ حروفِ علت، اعلانِ نون، تراکیب مُہنّد اور قافیہ و ردیف کے قاعدے، خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس مضمون میں انھیں قواعد پر اسی ترتیب کے ساتھ بحث کی جائے گی۔ اس سلسلہ کا یہ پہلا مضمون پیش کیا جاتا ہے۔

## سقوطِ حروفِ علت

لفظ کے آخر سے خواہ وہ کسی زبان کا ہو، حروفِ علت کا دبنا یا گرنا اساتذۂ متقدمین کے نزدیک کوئی عیب نہیں تھا۔ بیشتر اساتذہ متوسطین کا بھی یہی مسلک تھا۔ یہ صراحت ضروری ہے کہ حروفِ علت میں سے ی کا دبنا، عام تھا، اسم فعل، حروف ہر حرف کے آخر سے، حسبِ ضرورت اس کا سقوط روا رکھا جاتا تھا۔ حروفِ مغیرہ، حروفِ ربط اور ضمیروں کے آخر سے الف اور واؤ کو بھی بلا تکلف گرا دیتے ہیں۔ البتہ مفرد اسموں کے آخر سے واؤ اور فعلوں کے آخر سے الف کا گرنا، اس قدر عام نہیں تھا، اس میں احتیاط کی جاتی تھی۔ اگرچہ مثالیں ملتی ہیں۔

اردو نظم میں، گفتگو کی طرح، حروفِ علت کا دب کر نکلنا عام بات ہے۔ کبھی یہ شعر کی روانی پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن کبھی روانیِ کلام بے طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ غالب نے صفیر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا تھا:-

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی !

کیوں حضرت ! ابھی کچھ ، کی تحتانی کا دبنا غیر فصیح نہیں ؟
کچھ بھی بات کرنہیں آتی ۔ کیا اس کا نعم البدل نہیں ؟"

(غالب کی نادر تحریریں ص ۵۶)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اساتذۂ متوسطین ، حرفِ علت کے اس طرح دبنے کو جس سے فصاحتِ کلام پر حرف آجائے اچھا نہیں سمجھتے تھے ، اور اس ضمن میں عربی وفارسی اور ہندی الفاظ کی تفریق ان کے پیش نظر نہیں رہتی تھی ۔ غالب کے کلام میں متعدد جگہ فارسی وعربی الفاظ کے آخر سے یائے معروف کے سقوط کی مثالیں موجود ہیں ۔ مقصود یہ ہے کہ حروفِ علت کے دبنے کو مطلقاً غلط نہیں سمجھتے تھے ۔ اصل مقصد فصاحتِ کلام کا باقی رہنا تھا ۔ جہاں اس پر حرف آجائے ، وہاں وہ اس کو غلط سمجھتے تھے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ صحیح و غلط کا معیار نہایت مناسب تھا ۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ ناسخ کے زمانے میں اس عام اصول کو اس قاعدے میں تبدیل کر دیا گیا کہ عربی وفارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علت کو گرانا ، غلط ہے ، اس دلیل کے ساتھ کہ فارسی میں اس کی مثال نہیں ملتی ـــ " شیخ ناسخ کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ کو اخیر زمانے میں جو ہدایتیں کی تھیں ، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کلمے کے آخر سے الف ، واو ، یے کو بے تکلف گرا دینا اچھا نہیں ۔ مگر بقول مولوی حیدر علی صاحب (کذا) طباطبائی ، شیخ کی اس وصیت پر کسی سے عمل نہ ہو سکا ۔ لفظوں کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر مصرع میں بھر دینا ، اردو شاعری میں رواج پا گیا ۔ شیخ کا متنبہ کرنا اس بنا پر تھا کہ فارسی میں کہیں ایسا نہیں دیکھا کہ میکشی و میردی میں سے یے کو گرا دیں ۔ یا گفتگو وشست وشو میں سے واو ، دریا گویا کا الف ساقط ہو جانے دیں ۔"

(مولانا حسرت موہانی ۔ معائب سخن ص ۱۷)

مولانا حامد حسن قادری نے بھی ، اصلاحاتِ ناسخ کے ذیل میں ، اس قاعدے کا ذکر کیا ہے ۔ "عربی فارسی الفاظ کے آخر سے حروفِ علت (ا ۔ و ۔ ی) دبنے نہ پائیں . . . . . لیکن ہندی حروف میں دبنا جائز رکھا گیا ۔" (تاریخ وتنقید ادبیات اردو ص ۸۹) اساتذۂ متاخرین نے اس پابندی کو صحتِ بیان کا لازمی جز قرار دیا ۔ امیر مینائی کی رائے اوپر پیش کی جا چکی ہے داغ نے مولانا احسن مارہروی کی فرمائش پر ، عیوبِ شاعری سے متعلق ایک طویل قطعہ لکھا تھا ، جس میں اپنے شاگردوں کو ان عیوب سے بچنے کی ہدایت کی تھی ۔ اُس میں اس کا بھی ذکر ہے ۔

عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں حرفِ علت کا بُرا اُن میں ہے گرنا دبنا ،
الفِ وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا

(یادگارِ داغ ۔ ص ۱۹۵)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حروفِ علت میں سے الف اور واو اس بحث سے خارج ہیں ۔ فارسی میں واو کا سقوط مسلمات میں سے ہے ۔ اس قاعدے کے بنانے والوں نے اردو میں سقوطِ حروفِ علت کو اس لیے غلط بتایا ہے کہ فارسی میں اس کی مثال نہیں ملتی ، اس لیے واو اس فہرست سے خود بخود خارج ہو جاتا ہے ۔ رہا الف ، سو عربی فارسی الفاظ کے آخر سے اس کا سقوط نہ ہونے کے برابر ہے ۔ صرف یائے معروف اس بحث کا مرکز ہے ۔ اساتذہ نے جہاں جہاں حروفِ علت کا ذکر کیا ہے ، ان میں سے بیشتر مقامات پر درحقیقت یائے معروف کا سقوط ہی معرضِ بحث میں ہے ۔

قابلِ لحاظ یہ بات ہے کہ اس قاعدے کو مانا بہتوں نے ، لیکن اس پر پوری طرح عمل نہیں ہو سکا ، نہ اُن سے جنھوں

اس قاعدے کو بنایا تھا، اور نہ ان سے جنھوں نے محض تقلیداً اس کی پابندی کا اعلان ضروری سمجھا۔ اچھے اچھے استادوں کے یہاں اس کی مثالیں موجود ہیں اور خاصی تعداد میں۔ خاص طور سے جن شاعروں نے غزل کے علاوہ، مثنویاں یا نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس کی پابندی کو نہیں نبھا سکے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پابندی تھی ہی بے اصولی۔ بہت سے مقامات پر حرفِ علت کا دبنا نہایت بُرا معلوم ہوتا ہے، اس اعتبار سے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا لحاظ رکھے کہ محض ان حروف کے دبنے سے کلام میں ناہمواری نہ پیدا ہو۔ لیکن اس سلسلے میں عربی و فارسی اور ہندی الفاظ کی جو تفریق کی گئی ہے، وہ سرے سے غلط ہے۔ دو وجوہ سے:۔

(الف) اردو ایک مستقل زبان ہے۔ علم زبان کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی زبان میں دوسری زبانوں کے جو الفاظ شامل ہوجاتے ہیں وہ اسی زبان کا جز بن جاتے ہیں۔ اردو میں دنیا کی بہت سی زبانوں کے لفظ موجود ہیں۔ اب یہ سب لفظ اردو کے ہیں۔ ان پر اردو کے قواعد کا اطلاق ہوگا۔ اس لیے کسی تفریق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ب) حروفِ علت کے دبنے سے کلام میں جو عیب پیدا ہوتا ہے، وہ عام ہے۔ پھر اس کو فارسی و عربی الفاظ سے مخصوص کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس قاعدے کا تعلق حسنِ کلام اور چستی بندش سے ہے۔ اور ان دونوں محاسن کے لحاظ سے بہت سے مقامات پر، ہندی الاصل الفاظ میں حرفِ علت کا دبنا اتنا ہی برا معلوم ہوتا ہے، جتنا کہ غیر ہندی الفاظ میں۔ اصولاً لفظوں میں تمیز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً درج ذیل مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کو دیکھیے ان میں ایسے حروفِ علت ساقط ہوتے ہیں، جن کا گرانا قاعدے کے لحاظ سے جائز ہے، لیکن فصاحتِ کلام ہوا ہو گئی ہے:۔

عمر اپنی کٹی دنیا کے ستم گاروں میں (تسلیم) دنیائے عشق میں بڑے نام امتحاں کے ہیں (ایضاً) لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے۔ رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے (داغ۔ پوری غزل کی یہی صورت ہے) کرتا بیمارِ محبت کا مسیحا جو علاج (ذوق) تجھے تو اجل کی ہے آرزو، اسے وہم ہے کہ یہ مرگیا۔ (نظم طباطبائی) نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبشِ مژگاں کا صدمہ بھی (ایضاً) ہمہ تن محو رہا گو کہ تو خود بینی میں (عزیز لکھنوی) صحرا میں جب ہوئی مجھے خوش چشموں کی تلاش (امیر مینائی) آیا میں تیری مدد کے لیے قصہ فیصل (امیر) بال کھولے پریاں پھرتی تھیں سرِ دیوار پر (امیر)

اس قاعدے کی بنیاد جس تفریق پر رکھی گئی ہے وہ غلط ہے۔ حروفِ علت کے دبنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے، اس کا تعلق مجموعی طور سے حسنِ کلام سے ہے، نہ کہ الفاظ کی تقسیم سے۔ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ جس لفظ میں کوئی حرفِ علت دب رہا ہو اور اس سے فصاحتِ کلام پر اثر پڑے، تو یہ عیب ہے۔ اس سے کوئی بحث نہیں ہونا چاہیے کہ وہ لفظ کس زبان کا ہے۔

ذیل میں عہدِ ناسخ اور اس کے بعد کے اساتذۂ اردو کے یہاں سے، ایسی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن میں فارسی و عربی الفاظ کے آخر سے، حروفِ علت کا سقوط نمایاں ہے۔ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ لکھنؤ میں ناسخ اور ان کے تلامذہ نے اس قاعدے پر بہت زور دیا تھا، لیکن آتش اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس کی مثالیں عام ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس کو کوئی عیب ہی نہیں مانا۔ جو لوگ ان دونوں دبستانوں سے علیحدہ تھے۔ جیسے میرانیس، ان کے یہاں بھی اس ناسخی قاعدے کی پابندی نظر نہیں آتی۔ شعرائے دلی نے بہ استثنائے داغ اس کو کبھی من جملۂ عیوب نہیں سمجھا۔ اسی لیے اُن کے یہاں اس کی مثالیں بہ کثرت ہیں۔

لکھنؤ میں اساتذۂ متاخرین میں امیر مینائی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ عربی و فارسی کے الفاظ کے آخر سے حروفِ علت کے

سقوط کو عیب سمجھتے تھے (حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے) لیکن ان کے یہاں سقوط یائے معروف کی نہ معلوم کتنی مثالیں موجود ہیں اس سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ درجہ بندی والا قاعدہ، محض رسماً دہرایا جاتا رہا، عملاً اس کی خلاف ورزی ہوتی رہی ہے اور اس وجہ سے کہ ہندی وغیر ہندی الفاظ کی تفریق اصولاً غلط تھی۔ درج ذیل مثالیں محض، مشتے نمونہ از خروارے، کا حکم رکھتی ہیں۔

وحشی ہوں آدمی کے جنگل کا۔ ناسخ (کلیات مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۲۳ء (ص ۶ پ)

کام خونریزی ہے اس یوسف بازاری کا۔ ناسخ (ص ۱۱)

آیا ہے یا دپیری میں عالم شباب کا " (ص ۱۹)

مجھ کو تو یار سے ہے ہم آغوشی کا خیال " (ص ۸۸)

الہی خنجر سفاک آبدار نہ ہو " (ص ۱۲۵)

---

مشکل، کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا آتش (کلیات نولکشور پریس ص ۴)

ناقص ہے دستنداری میں کامل نہیں ہے تو " (ص ۸)

آزادی سے زیادہ اسیری میں لطف ہے " (ص ۸)

فتنہ پردازی جسے کہتے ہیں فن ہے کس کا " (ص ۱۸)

منہ کتابی قطبی ہے، خط حاشیہ ہے میر کا " (ص ۲۱)

زائچہ بھی نقل ہے پیشانی کی تحریر کا " (ص ۲۶)

عزلت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ " (ص ۴۴)

زلف وال افعی ہے، یاں داغ جگر مہرہ ہے " (ص ۴۳)

موجد اس کی ہے سیہ روزی ہماری آتش " (ص ۴۸)

گماں ساقی پہ صیاد کا ہوا مجھ کو " (ص ۵۴)

وہی دیوانگی میری ہے، بہار آنے دو " (ص ۶۶)

صرف الف کی ردیف میں ابھی اتنی ہی اور مثالیں مل سکتی ہیں۔

دل کی بے تابی نے بیارے مجھے ناچار کیا۔ امانت لکھنوی (واسوخت امانت)

آبرو ریزی سے شاید تو نہیں ڈرتا ہے " "

دل کی بے تابی سے گودی میں اٹھایا اس کو " "

کردی اک تفرقہ اندازی کی صورت باہم " "

جب کہ عیاری میں کامل ہوا وہ ماہ تمام " "

میں نے اس گل کو جو بیرنگی میں کامل پایا " "

میں بھی تو آدمی کی جان ہوں، حیوان نہیں " "

| | | |
|---|---|---|
| کبھی کہتا ہوں پریشانی میں شامِ ہجراں | آمانت لکھنوی | (واسوخت امانت) |
| آگے اس بینی کے خود بینی تری ہے بے کار | " | " |
| وصل سے شادی ہوئی، کھل گئے عقدے دل کے | " | " |

---

| | | |
|---|---|---|
| خاموشی میں یاں لذتِ گویائی ہے | انیس | (روحِ انیس ص ۲۷۶) |
| فخر سے حاشیہ بردار کو شوکت آئی | " | (ص ۲۱۳) |
| تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ | " | (ص ۲۷۶) |
| اللہ ری صفائی، لہو میں نہ تر ہوئی | " | |
| ابن زہرا! تری مظلومی کے ہمشیر نثار | " | |
| جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد | " | |

---

| | | |
|---|---|---|
| پاکدامانی میں تیری نہیں پڑنے کا خلل | رند لکھنوی | (دیوان مطبوعہ نولکشور پریس (ص ۲) |
| الہیٰ دیکھیے واماندگی کہاں پہنچاتے | " | (ص ۴) |
| مینخواری کی تکلیف نہ دے روزوں میں ساقی | " | (ص ۱۱) |
| ایماے ملاقات تھی خاموشی ہماری | " | (ص ۱۱) |
| دم میں دم باقی ہے جب تک، نہ اٹھا یار سے ہاتھ | " | (ص ۱۱) |
| پاکدامانی کا دعویٰ نہ کرے اس رو سے | " | (ص ۱۳) |
| پھر راتیں کاٹنے لگے اختر شماری میں | " | (ص ۱۴) |
| جو ہر وہ خاکساری نے پیدا کیا مری | " | (ص ۱۵) |

دیوانِ رند ۱۶۲ صفحات پر حاوی ہے۔ مندرجہ بالا مثالیں شروع کے صرف ۱۵ صفحات سے پیش کی گئی ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| دکھلایا ناتوانی نے گھر یار کا مجھے | صبا لکھنوی | (دیوانِ صبا موسوم بہ غنچۂ آرزو ص ۱۶) |
| خود بینی کا رواج کبھی پیشتر نہ تھا | " | (ص ۳۵) |
| سودائی کس قدر ہے شبِ تار کا مزاج | " | (ص ۴۷) |
| خالی کر دیجے قاتل کا نمکدان کیونکر | " | (ص ۶۵) |
| جو گلفشانی کی جا، ہے تنگ بار چراغ | " | (ص ۷۲) |

---

| | | |
|---|---|---|
| درازدستی یہ کس بے ادب نے کی دمِ قتل | مومن | (دیوان مومن مرتبہ ضیا احمد بدایونی ص ۱۳۷) |
| یہ بے حجابی مری، گو مجھی کو جھجکو تم | " | (ص ۱۳۷) |
| غزل سرائی کی مومن نے کیا کہ رشک سے آج | " | (ص ۱۳۸) |

| | | |
|---|---|---|
| مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی | مومن | (دیوانِ مومن مرتبہ ضیا احمد بدایونی۔ ص ۱۹۴) |
| در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے | " | (ص ۲۲۸) |
| بیزارِ زندگی کا جینا محال تھا | " | (ص ۲۴۶) |
| سر سے شعلے اٹھتے ہیں، آنکھوں سے دریا جاری ہے | " | (ص ۱۸) |

---

| | | |
|---|---|---|
| آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو | غالب | (دیوانِ غالب مرتبہ عرشی صاحب ص ۳۰۱) |
| کوئی ویرانی سی ویرانی ہے | " | (ص ۱۵۲) |
| خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے | " | (ص ۲۱۹) |
| پنبۂ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں | " | (ص ۱۰۳) |
| سینۂ بیتابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار | " | (ص ۲) |
| بیضۂ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل | " | (ص ۴) |
| ناخن کو جگر کاوی میں بیرنگ نکالوں | " | (ص ۶۰) |

---

| | | |
|---|---|---|
| الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں | ذوق | (دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد ص ۴۷) |
| الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا | " | (ص ۴۷) |
| کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق | " | (ص ۷۵) |
| الٰہی خیر ہو، مانندِ شعلۂ سرکش | " | (ص ۱۱۸) |
| کہ سینہ کاوی میں یاں نامور کو دیکھتے ہیں | " | (ص ۱۴۷) |
| الٰہی چشم کے چشمے کو اتنا آب تو دے | " | (ص ۱۹۸) |
| الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے | " | (ص ۲۱۰) |
| نہیں وہ آدمی، لیکن سب آدمی کے ڈھنگ | " | (ص ۳۹۸) |
| نقش سجدے کا ہے پیشانی کا ٹیکا ہم کو | " | (ص ۱۶۷) |
| حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر | " | (ص ۳۶۳) |

---

| | | |
|---|---|---|
| سچ ہے، محبوب جو لاثانی ہے، وہ یکتا ہے، | محسن کاکوروی | (کلیاتِ نعتِ محسن ص ۳۸) |
| عرش پر کرسی بچھاتے ہے مرا ذہنِ رسا | " | (ص ۳۸) |
| اک رگِ مخفی ہے مابینِ دو ابروئے سیاہ | " | (ص ۴۰) |
| اُمّی ہونے میں، بھلا آپ سے شبہ کیا ہے | " | (ص ۴۲) |
| رہے خونریزی کا نقشہ دماغِ کجکلاہاں میں | " | (ص ۴۳) |

| | | |
|---|---|---|
| بکرو جی یاروں کو دکھلاؤں میں | محسن کاکوروی (کلیات نعت محسن ص ۸۸) | |
| اس کی پیشانی پہ دیباچہ مائل و دل | " | (ص ۹۴) |
| کیسی افسردگی کیا بات ہے مرجھانے کی | " | (ص ۱۰۵) |
| اک راستی لاکھ بانکپن ہے | " | (ص ۱۲۴) |
| تاریکی میں نور یا الٰہی | " | (ص ۱۲۷) |

| | | |
|---|---|---|
| باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے | نواب مرزا شوق لکھنوی | (مثنوی زہر عشق) |
| سختی ساری بتوں کے دل کو دی | " | " |
| ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں | " | " |
| میری رسوائی کا خیال رہے | " | " |

| | | |
|---|---|---|
| رسائی کچھ نہیں دشوار بام تک اس کے | امیر مینائی | (صنم خانۂ عشق ص ۲) |
| چھپ کے تنہائی میں اغیار سے رو دیا ہوگا | " | (ص ۱۴) |
| تیری بیدردی ہی اچھی تھی ترس کھانے سے | " | (ص ۲۸۱) |
| پاس یکتائی کا اس شوخ کو ایسا ہے امیر | " | (ص ۳۳۹) |
| طرفۃ العین میں وہ روشنی پہنچی جو قریب | " | (مرآۃ الغیب ص ۳۵) |
| بطخیاں پھرتی ہیں آبادی سے اکثر باہر | " | (ص ۲۰۰) |
| یہ شیخ سعدی ہے جس نے کہ چشم روشن کو | " | (ص ۲۷) |
| نہ بے وفائی کا غم تھا، نہ ڈر جدائی کا | " | (ص ۸۴) |

| | | |
|---|---|---|
| الٰہی تو نے ہمیں کس بلا میں ڈال دیا | داغ | (گلزار داغ۔ مطبوعہ مطبع تیغ بہادر لکھنؤ ص ۱۳) |
| مثال عارض صفائی رکھنا، برنگ کاکل کجی نہ کرنا | " | (ص ۱۴) |
| وہ بت کرے خدائی کی باتیں، خدا کی شان | " | (ص ۱۹) |
| کیا جانے، وہ خدائی کا مارا کہاں ہے اب | " | (ص ۷۲) |
| الٰہی، شیخ بھی مے خوار ہو مغاں کی طرح | " | (ص ۸۲) |
| الٰہی، قاصد کی خیر گزرے کہ آج کوچے سے فتنہ گر کے | " | (ص ۱۰۰) |
| الٰہی دم مری آنکھوں میں پھیر کھا کے نہ آتے | " | (ص ۱۰۸) |
| الٰہی، غیر نے کی کون سی وفاداری | " | (ص ۱۴۱) |
| الٰہی، تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا | " | (ص ۱۵۲) |

| | | |
|---|---|---|
| اس بت میں اب خدائی کا جلوہ ہے ورنہ شیخ | داغ | (گلزار داغ مطبوعہ مطبع تیغ بہادر لکھنؤ) |
| الٰہی، جائیں گے کب گھر یہ ہم سے وحشتناک | " | (ص ۱۹۵) |
| الٰہی، خیر ہو، وہ خشم ناک آتے ہیں | " | (ص ۲۳۳) |

---

| | | |
|---|---|---|
| گھر میں جو سپیدی چار سو تھی | احمد علی شوق قدوائی | (مثنوی ترانۂ شوق) |
| دانتوں سے کبودی لب پہ آئی | " | " |
| چاندی کی رگڑ سیاہی لائی | " | " |
| دانائی تھی ختم اس پری پر | " | " |
| آزادی کو مشتری نے کھویا | " | " |
| تقدیر کی نارسائی کب تک | " | " |

---

| | | |
|---|---|---|
| تنہائی میں رنج شب یلدا ہے قیامت | حسرت موہانی | (دیوان ششم ص ۷) |
| رعنائی میں آفت ہیں ترے لب پہ تبسم | " | (ص ۷) |
| اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں | " | (دیوان چہارم) |
| یعنی جب یہ ہے تو نسکر بے نوائی پھر کہاں | " | " |
| پھر کبھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو | " | " |
| یعنی ہم نے کس لیے غلط جتائی آپ کی | " | (دیوان ششم) |

---

| | | |
|---|---|---|
| پیسے کھائے یا کوئی قربانی دے | اثر لکھنوی | (نغمۂ جاوید ترجمہ گیتا) |
| وہ اندھے ہیں دانائی سے کوسوں دور | " | " |
| خوشی سے صفا کوشی مضبوط ہے | " | " |
| ہنسی ہوتی ہے اتنی ہی مبہم | " | (نو بہاراں ص ۱۷۱) |
| راستی وہ جو ہم سخن تجھ سے ہوئی ہو برملا | " | (ص ۱۱۵) |

یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ لفظ کے آخر سے حروف علت کا دبنا ناگزیر ہے اس لیے اس کو غلط کہنا بے معنی بات ہے،
[...]ت سے مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں، جہاں حرف علت کا سقوط ہی مناسب بلکہ فصیح ہوتا ہے۔ حروف مغیرہ، یعنی کا، کو، کے
[...]ی، نے، را، ری، رے، اور جو، سو، میں، سا، کو، ہیں یہ صورت اکثر پیش آتی ہے۔ مثلاً تم کو ہے وصل غیر سے انکار۔ منہ اس
[...]چڑایا تو ہنسی آگئی مجھ کو۔ ننگ میخانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا۔ ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن۔ دنیا کا ورق پیش ارباب
[...]نظر ہیں۔

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ اردو کی جمعیں (جن کے آخر میں یں یا وں ہوں) یا ایسے افعال جن کے آخر میں یہ حروف یکجا ہوں

جیسے تصویریں ، دیکھیں ، دیکھوں ، ان میں بھی بہت سے مقامات پر حرفِ علت کا سقوط برا نہیں معلوم ہوتا ۔ اردو جمع کے بعد اگر کوئی لاحقہ آجائے ، جیسے گیسوؤں والا ، اس صورت میں عموماً حروفِ علت کا سقوط ہی اچھا معلوم ہوتا ہے ، جیسے :۔

گل ہیں چراغ گیسوؤں والوں کے سامنے ۔

مفرد الفاظ کے آخر سے بھی کبھی کبھی واو کا دب کر نکلنا اچھا معلوم ہوتا ہے مثلاً ۔ دعوئ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے ۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس کا تعلق بول چال سے بھی ہے ۔ بات چیت میں ، جن لفظوں میں آخری حرف دَب جاتے ہیں ، ان کا سقوط شعر میں بھی برا نہیں معلوم ہوتا ۔ مثلاً لفظ گیسو ، بہ اظہار واو مستعمل ہے لیکن گیسوؤں والا ، عموماً بہ سقوطِ واو بولا جاتا ہے ۔ گیسو رخ پہ ہوا سے ہلتے نہیں دز ہر عشق ، اس مصرع میں گیسو کے واو کا دبنا ، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔ لیکن گل ہیں چراغ گیسوؤں والوں کے سامنے ، اس میں سقوط ہی فصیح ہے ۔

غالب کے اس مصرع میں :۔ لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی واو کا اشباع بھلا نہیں لگتا ۔ بات یہ ہے کہ سقوطِ حروفِ علت کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا ۔ درحقیقت اس کا تعلق محل استعمال سے ہے اور اس اعتبار سے اس کی خوبی و خامی کا فیصلہ کرنا چاہیے

افعال کے آخر سے عموماً اور بہت سے اسما کے آخر سے خصوصاً الف کا گرنا ، مخل فصاحت ہوتا ہے ۔ جیسے داغ کی اس غزل کی ردیف میں :۔ لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے ۔ اب آپ ہندی و فارسی الفاظ کی مفروضہ تفریق کا سہارا لے کر اس کو جائز بتاتے رہیے ، فصاحتِ کلام منہ پھیرے گی ۔

ایسے مرکبات ، جن میں پہلے لفظ کے آخر میں یائے معروف ہو ، گفتگو میں عموماً یہ یَ دب کر نکلتی ہے ۔ نظم میں بھی اس کے دبنے سے کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی ، بلکہ حسنِ گفتگو باقی رہ جاتا ہے جیسے یونانی علاج ، ہوائی جہاز ، کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۔ پیاری پیاری کلائیاں اس کی ۔ اس سلسلے میں آرزو لکھنوی مرحوم کے ایک خط کا اقتباس افادیت سے خالی نہیں ہوگا ۔

" الف ، واو اور ی ، عربی کے لیے حروفِ علت ہیں ۔ مگر اردو ۔ کے لیے حروف اتمام حرکات ہیں ۔ اس وقت ک تلفظ میں دبتے ہوئے آئیں (کذا) ، لہٰذا کتابت میں ان کا آنا صرف اظہار حرکات کے لیے ہوتا ہے ۔ ایسے تمام حروف کا ا جائز ہے ۔ چاہے وہ عربی و فارسی کے کیوں نہ ہوں مثلاً نفسی نفسی میں پہلی ی بولتے وقت دبتی ہے ، لہٰذا اس کا اسقاط ہی فصیح ہے ۔ فارسی میں ہائے مختفہ کا اسقاط ہی فصیح سمجھا جاتا ہے تو ، اور جو ، کا واو بھی ظاہر ہو تو غیر فصیح ہے اب یقین ہے کہ آپ سمجھ جائیں گے ۔ جو لوگ ہندی کے الفاظ میں بھی ناجائز سمجھتے ہیں ۔ وہ اپنی سمجھ کے مالک ہیں ۔ ہمیں دوسروں کے مسلک سے کیا واسطہ

(مکتوب آرزو بنام نفیس بنگلوری ۔ شائع شدہ ہماری زبان (علی گڑھ) شمارہ یکم فروری ۶۲ء)

اس خط کے حاشیے میں آرزو صاحب کا یہ شعر بھی لکھا ہوا ہے ، جس میں لفظِ نفسی نفسی آیا ہے ، اور پہلے لفظ کی یا معروف ساقط ہو گئی ہے ۔ پڑی ہے ہر اک کو اپنی اپنی ، ہے انبیا میں بھی نفسی نفسی تمہیں کو اک رٹ ہے امتی کی ، شفیعِ جزا تمہیں ہو ۔ آرزو صاحب نے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اردو میں حروفِ علت کی کیا حیثیت ہے ، وہ خاص ط سے توجہ طلب ہے ۔ یہ مسلمات میں سے ہے کہ آرزو صاحب ! بہت سے مدعیانِ زبان دانی و قواعد آشنائی سے کہیں زیادہ ان مسائل کے متعلق علم رکھتے تھے ۔

جن افعال کے آخر میں یائے معروف ہو ، ان کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ۔ کہیں سقوط ہوگا ، کہیں گوارا ۔ یہی صورت اسما کی ہے ۔ اس کا تعلق محض محلِ استعمال سے ہے ۔ مثلاً یہ مصرع دیکھیے :۔

الہیٰ خیر، کہ اب آگ پاس آن لگی
دربدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہونا ہے
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

ان مصرعوں میں سقوط یا مخلِ فصاحت نہیں ہے۔ لیکن ان مصرعوں میں :-

سر سے شعلے اٹھتے ہیں، آنکھوں سے دریا جاری ہے
مجھ کو تو یار سے ہے آغوشی کا خیال

سقوط قطعاً مخلِ فصاحت ہے۔

مختصر یہ کہ لفظ کے آخر سے حروفِ علت کا دبنا قابلِ قبول بھی ہو سکتا ہے اور ناقابلِ قبول بھی۔ اسکا انحصار محلِ استعمال پر ہے۔ نہ اس میں ہندی وغیر ہندی الفاظ کی تفریق کی جا سکتی ہے، نہ کوئی قاعدہ کلیہ بنایا جا سکتا ہے کہ یہاں غلط ہے، وہاں صحیح۔ اصل معیار یہ ہے کہ جہاں بھی حروفِ علت کے دبنے سے مصرع کی روانی پر اثر پڑے، وہاں اس کا دبنا غلط ہے، خواہ وہ لفظ کسی زبان کا ہو۔ جہاں یہ صورت نہ ہو، وہاں مطلق عیب نہیں۔


نگار پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۳ء

# نیاز نمبر

جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہلِ قلم اور اکابرِ ادب نے حصہ لیا ہے اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو، مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوبِ نگارش، انشا پردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری اور ادارتی زندگی، ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ صفحات ۴۲۴ قیمت آٹھ روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

## انسان کی ذہنی تاریکی کا

# عبرتناک دور

نیاز فتحپوری

(۱) پندرھویں صدی میں انگلستان کا قانون تھا کہ اگر کوئی شخص انجیل مقدس کا مطالعہ اپنی مادری زبان میں کرے گا تو اس کی جائداد ضبط کر لی جائے گی اور وہ حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا چنانچہ اس قانون کے نفاذ کے بعد ۳۹ آدمی پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کی لاشیں سرِ بازار جلائی گئیں۔

(۲) سولھویں صدی میں فرانس کی حکومت نے ایک شخص کو صرف اس خطا پر آگ میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا کہ وہ راہبوں کے ایک جلوس کے سامنے دوزانو نہ ہوا تھا۔

(۳) عہدِ وسطیٰ کے باشندوں کا یہ عام عقیدہ تھا کہ شیطان انسان کے اندر حلول کر جاتا ہے اور وہ اسے ناپاک افعال کے ارتکاب پر مجبور کرتا ہے، چنانچہ اس عقیدہ کی بنا پر جیمس اول کے زمانہ میں ایک شخص اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا اس جرم میں جلا دیا گیا کہ وہ شاہی خاندان کو ڈبونے کے لیئے سمندر میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔ ایک بار سر میتھو ہیل کے سامنے جو انگلستان کا مشہور جج تھا ایک عورت پیش کی گئی اور الزام یہ تھا کہ وہ بچوں سے سوئیوں کی قے کراتی ہے، چنانچہ جج صاحب نے اسے زندہ جلوا دیا ——— ایک شخص پر کسی بھیڑیئے نے حملہ کر دیا، اس نے مقابلہ کر کے بھیڑیئے کا پنجہ کاٹ لیا اور جیب میں رکھ کر گھر پہنچا۔ دیکھا کہ اس کی بیوی کا ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ اس لیئے یقین کر لیا گیا کہ اس کی بیوی ہی بھیڑیا بن کر گئی تھی اور اسے جلا دیا گیا ——— ۱۴۷۴ء میں اتفاقاً کسی مرغ نے انڈا دیدیا۔ عدالت گاہ میں پیش کیا گیا تو جج نے یہ فیصلہ دیا کہ اس کے اندر یقیناً شیطان حلول کر گیا تھا اور اسے سرِ راہ جلا دیا گیا۔

(۴) کسی وقت یورپ کا قانون تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شخص رات کو داخل ہو تو اس کو قزاق سمجھ کر مار ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس سلسلہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی کو بہانہ سے بلا کر مار ڈالے اس لئے قانون میں یہ ترمیم کی گئی کہ مالک مکان گھر کے کسی پالتو جانور کے سامنے اپنی بے گناہی کی قسم کھائے، کیونکہ اگر وہ جھوٹا ہوگا تو جانور ضرور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اظہار کرے گا۔

(۵) یہ بھی انگلستان کا قانون تھا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار نہ کرے تو اسے ہاتھ میں پنیر اور روٹی کا ٹکڑا لیکر کہنا پڑتا تھا کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے یہ میرے حلق میں پھنس جائے۔

(۶) لوگوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ گرمیوں میں پالا گراتے ہیں، اولے برسا کر فصلیں تباہ کرتے ہیں، شراب ترش کر دیتے ہیں، گائے کو بانجھ بنا دیتے ہیں اور انھیں ساحر سمجھ کر جلا دیا جاتا تھا۔

(۷) تخو براہی اپنے وقت کا مشہور ہیئت داں تھا لیکن اسی کے ساتھ سحر و افسوں کا بھی قائل تھا اور بہت سے مہمل الفاظ ایک جگہ لکھ کر پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور ان کے پورا ہونے کا منتظر رہتا تھا۔

(۸) لوتھر کو یقین تھا کہ اس کی ملاقات شیطان سے ہوئی تھی اور بعض مذہبی مسائل پر مباحثہ ہوا تھا۔

(۹) چارلس پنجم شاہ جرمنی کے زمانہ میں اسٹوفلر بڑا مشہور ہیئت داں گزرا ہے۔ اس نے ایک بار حکم لگایا کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے اور اس پر یقین کرکے ہزاروں آدمیوں نے جو نشیبی حصہ زمین پر مقیم تھے ترک وطن کر دیا اور فرانس میں ایک بہت بڑی کشتی تیار کرکے لئے ذخائر سے بھر لیا، لیکن طوفان نہ آنا تھا نہ آیا۔

(۱۰) ۱۵۶۱ء میں اینڈرے کیپ نے ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے بتایا کہ بہشت میں آدم کی زبان کیا تھی، چنانچہ اس نے لکھا کہ خدا نے آدم سے سویڈن کی زبان میں باتیں کیں اور آدم نے ڈنمارک کی زبان میں جواب دیا، لیکن سانپ نے حوا سے جو باتیں کیں وہ فرانسیسی زبان میں تھیں؛ اسی طرح ایروے نے اپنی ایک کتاب میں جو میڈرڈ سے شائع ہوئی تھی ظاہر کیا کہ جنت عدن میں شمالی اسپین کی بسکائی زبان رائج تھی۔

(۱۱) چھٹی صدی عیسوی میں ایک راہب نے جس کا نام سماس تھا ایک کتاب ہیئت و جغرافیہ پر لکھی اور ظاہر کیا کہ زمین مسطح ہے اور کسی وقت دائرہ دار ٹکڑوں میں پانی اس کے چاروں طرف بھرا ہوا تھا۔ پانی کے اس حصہ سے آگے ایک حلقہ خشکی کا تھا اور طوفان نوحؑ سے پہلے انسانی آبادی صرف یہیں پائی جاتی تھی، یہیں ایک بلند پہاڑ تھا جس کے گرد سورج اور چاند طواف کرتے تھے۔ جب سورج اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا تو رات ہو جاتی ہے اور جب سامنے آتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ خشک حصہ زمین کا کنارہ آسمان سے بندھا ہوا ہے اور نہ کسی ٹھوس چیز کا بنا ہوا ہے جو ایک بڑے کڑھاؤ کی طرح زمین کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اس نے لکھا کہ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہے گا تو وہ کافر بے دین قرار دیا جائے گا اور سزا کا مستوجب ہوگا، چنانچہ اس وقت اگر کسی کے منہ سے نکل گیا کہ زمین کرہ ہے تو اسے پکڑ کر جلا دیا گیا، اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ آفتاب نظام شمسی کا مرکز ہے تو اسے جلا وطن کر دیا گیا۔

(۱۲) پانی اور آگ کے ذریعہ سے بھی جرم و بے گناہی کی جانچ ہوتی تھی۔ یعنی ایک مجرم کے ہاتھ میں تپا ہوا سرخ لوہا دے دیا جاتا تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو اس کا ہاتھ نہیں جلے گا، اسی طرح اسے دریا میں ڈال دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اگر وہ معصوم ہے تو محفوظ رہے گا ورنہ ڈوب جائیگا۔

(۱۳) عام عقیدہ تھا کہ انسان اپنی روح کا مالک ہے نہ جسم کا اور اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں غلامی کی بنیاد قائم ہوئی، اور یونان، روم، فرانس اور جرمنی میں لاکھوں انسانوں کو غلام بنا کر جانوروں کا سا سلوک ان سے کیا گیا۔

---

یہ تھا وقت جب انسان صرف سپاہی تھا یا مذہبی رہنما، یعنی لڑنے اور جھوٹ بولنے کے سوا انسان کو کوئی اور کام نہ تھا، اس کا جسم و دماغ دونوں مقید تھے۔ ایک کیلئے لوہے کی زنجیریں تھیں اور دوسرے کے لئے واہمہ پرستیوں کی۔!

# جدید عربی ادب

## ڈاکٹر اعجاز احمد

جسے عام طور سے جدید عربی ادب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کے ابتدائی خدوخال ہمیں انیسویں صدی کے اوائل سے اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ادب جدید کے اثرانگیز عوامل دنیائے عرب میں کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم عربی ثقافت کا جدید مغربی تہذیب و تمدن سے اختلاط، امریکی اور فرانسیسی مبلغین کی شام اور لبنان میں آمد و رفت، مطابع کا قیام، اخبار و رسائل کی اشاعت، مستشرقین یورپ کی عربی زبان و ادب سے بڑھتی ہوئی دلچسپی اور تالیف و ترجمہ کی طرف ان کی توجہ، مصر کے طلباء کے حصول تعلیم کے لئے یورپ جانا، مغربی علوم و فنون کا مطالعہ، یورپ کے مشینی انقلاب سے سبق آموزی، تعلیم نسواں کی کوششیں اور عرب قومیت کا گہرا احساس ــــ یہ ہیں وہ اسباب و عوامل جو رفتہ رفتہ اپنا کام کرتے رہے اور جنھوں نے تقریباً انیسویں صدی کے وسط میں ادب عربی میں ایک نئی رُوح پھونکی، نئے ادب کو جنم دیا، نئے اسالیب بیان، نئے مضامین، نئے طرز فکر اور نئی تعبیرات پیدا کیں، عہد جدید کے اصناف ادب، قصے، ناول، ڈرامے، علمی ادبی، تاریخی اور تنقیدی مقالے وجود میں آئے نثر جو سجع و تلفیے اور محاسن لفظی کے قیود میں گرفتار رہتی وہ ان بندشوں سے آزاد ہوئی۔ الفاظ سے زیادہ معانی کی طرف توجہ ہوئی۔ نظم جو مدحیہ، قصائد، تعزیتی مراثی اور عشقیہ مضامین سے آگے قدم نہ رکھتی تھی اب اس کی جولانگاہ میں نئے نئے مضامین شامل ہونے لگے۔ فطرت سے سرگوشی سماج کے عیوب و محاسن کی تصویر کشی اور جذبات انسانی کی ترجمانی اس کے خاص مشاغل بن گئے اور جب اس معنوی آزادی کیساتھ اسے قوافی کی ظاہری پابندی گراں گزری تو اس کا بھی جوا اپنی گردن سے اتار پھینکنے کی خواہش کی۔ اس طرح سے ادب عربی کا کاروان، انقلابات و تجربات کے ریگستانوں اور نخلستانوں سے ہوتا ہوا تجدد کی صدی سوا صدی کے اندر اب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں وہ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ادبوں کے ساتھ قدم بقدم رواں دواں ہے۔

دنیائے عرب کا جو ملک جتنا پہلے ان مذکورہ بالا اسباب و عوامل کے زیر اثر آیا ہے اتنے ہی پہلے وہاں زبان و ادب میں تبدیلی بھی نمایاں ہوئی۔ اس اعتبار سے مصر و لبنان سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے شام و عراق اور ان سے پیچھے حجاز و عمان اور یہی وجہ ہے کہ عربی بولنے والے تمام ملکوں میں تجدید و تجدد کی یہ لہر بیک وقت وجود میں نہیں آئی بلکہ الگ الگ زمانوں میں ظہور پذیر ہوئی اور اسی لئے کم و بیش ہر ایک عربی بولنے والے ملک کی ایک مستقل تاریخ ادب ہے، اور اس کے اپنے ذاتی ادبی رجحانات کی ایک علیحدہ داستان ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ کوئی بھی ملک ہو، شام ہو کہ حجاز، مصر ہو کہ عراق، مراکش ہو کہ سوڈان ہر

بھی انیسویں صدی سے پہلے اس قسم کی ادبی بیداری کا پتہ نہیں چلتا۔

## خاص رُجحان

انیسویں صدی کے اواخر تک ادب عربی میں جو خاص رجحان ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے کے ادبار اور شعراء میں ادبی جمود اور رکاکت سے گلو خلاصی کی کوشش نمایاں ہے اور وہ لوگ قدیم عباسی عہد کے طاقتور اور حقیقی انداز بیان کے اپنانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس حیثیت سے دراصل وہ زمانہ شعر و ادب کے احیا کا زمانہ ہے اور اس دور کا ادب، عباسی ادب سے ملتا جلتا ہے صرف ایک نمایاں فرق کے ساتھ اور وہ یہ ہے کہ عباسی دور کی شاعری پر ایک قسم کی بورژوائی چھاپ لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور وہ عوامی ادب کہے جانے کی مستحق نہیں ہے اس لئے کہ شعر و شاعری کا وجود اس زمانہ میں زیادہ تر خلفاء اور امراء کے خوش کرنے کے لئے ہوتا تھا اور چونکہ یہ لوگ سماج کے اونچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس میں علماء بھی تھے اور فلاسفر بھی، ماہرین لغت بھی تھے اور صنائع بدائع کے فن کار بھی۔ اس لیئے ان کے ذہنی معیار اور ثقافتی مقام کو سامنے رکھتے ہوئے شعراء اپنا انتہائی آراستہ و پیراستہ کلام پیش کرتے تھے جو پُر شکوہ الفاظ میں اور دقیق معانی سے مملو ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اس دورِ احیاء کا ادب عام فہم الفاظ پر مشتمل ہے اس لئے کہ اس کی تخلیق جمہور کی رضا جوئی اور ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیئے ہوتی ہے لیکن تکنیک کے اعتبار سے قدیم و جدید میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ڈاکٹر شوقی ضیف جو قاہرہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر اور عربی زبان کے ایک مشہور جواں سال ناقد ہیں اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

> "بہرحال ہمارے یہاں کے اس دورِ احیاء کے شعرائنے اور جن کے آگے حافظ اور شوقی نظر آتے ہیں شعر کو منزلوں آگے بڑھا دیا ہے۔ انھوں نے اگر ایک طرف شعر کے اوزان اور اس کی بناوٹ میں عہد عباسی کی قدیم پابندیوں کو برقرار رکھا ہے تو دوسری طرف انھوں نے اسی شعر کے ذریعے ہمارے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی کی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ ان شعرائنے ہماری شاعری کو اس کی قدیم بار آور زندگی پھر سے عطا کر دی ہے اور اسے ایسا مسخر کر لیا ہے کہ وہ انتہائی دقیق نگاہی سے ہماری روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔"
>
> (عربی سے ترجمہ)

بیسویں صدی کے شروع میں مصر میں شعر و شاعری کا ایک نیا مکتب خیال پیدا ہوا جس کے نمائندے عبدالرحمٰن شکری، ابراہیم عبدالقادر المازنی اور عباس محمود العقاد وغیرہم تھے۔ یہ گروہ فرانسیسی کے مقابلہ میں انگریزی سے زیادہ متاثر تھا اور اس پر انگریزی اور دوسرے مغربی ادبوں کا ثقافتی رنگ بھی چڑھا ہوا تھا چنانچہ اس گروہ نے اس دور احیاء کے شعراء پر اس عنوان سے حرف گیری شروع کی کہ یہ شعراء اپنے کلام میں داخلی جذبات کا اظہار نہیں کرتے جس سے ان کی نفسیات کا مطالعہ کیا جا سکے اور نہ ان کی شاعری میں ان کے ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی شاعری کا موضوع بھی ہماری روزمرہ کی عام زندگی ہوتی ہے۔ اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں اور انھیں اپنے کلام میں جگہ دیں، اسی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ دور احیاء کے یہ شعراء، قدیم شاعری کی مخصوص بناوٹ اور اس کے اوزان کی حفاظت میں بھی زیادہ غلو سے کام لیتے ہیں۔

## شعر کا تصور ــــــ نیا نظریہ

دراصل یہ نیا مکتب خیال شعر کے تصور اور اس کے مفہوم کے بارے میں اپنا ایک الگ نظریہ رکھتا تھا، ان کا خیال تھا کہ شعر،

نفس انسانی کا ترجمان ہے۔ لہٰذا ایک انسان کے دل میں دکھ درد اور خیر و شر کے جو جذبات موجزن ہوں شعر میں ان کی صحیح تصویر ہونی چاہیئے اسی کے ساتھ ساتھ فطرت، اور اس کے اسرار و رموز کے حقائق سے پردہ اٹھانا بھی ایک شاعر کا فریضہ منصبی ہے۔ اس نئے مکتب خیال کے نزدیک کسی قوم کے حادثات و واقعات کا وزن و قافیہ کے ساتھ رکارڈ کر لینا شاعری نہیں ہے۔ بلکہ شاعری نام ہے ان جذبات انسانی کی تصویر کشی کا جن سے شاعر کا نفس مملو ہے۔ اور وہ خود بخود شاعر کی زبان پر نغمۂ جاوداں بن کر جاری ہو جائیں۔ اور یہ نغمہ شاعر کے اس تعلق کو بھی صاف طور پر بتاتا ہو جو اسے اس کائنات ارضی سے وابستہ کیئے ہوئے ہے۔

چنانچہ مصر میں برسوں شعر و شاعری کے صحیح تصور، اور ان کی صوری اور معنوی صفات و خصوصیات پر نقد و تبصرے ہوتے رہے جن کی مدد سے جدید عربی شاعری نے ارتقائی منزلیں طے کیں اور مصر میں ایک اچھی خاصی تعداد باکمال شعراء کی پیدا ہو گئی، نئی نئی انجمنیں اور جماعتیں ادب کی خدمت کے لیئے وجود میں آئیں تاکہ ایک اعلیٰ قسم کا مقصدی ادب پیدا ہو، مستقل ادبی پرچے کثیر تعداد میں نکلنے لگے۔ جن میں ادب کے مختلف اقدار اور اس کے حقائق پر مضامین شائع ہوتے، ممتاز مغربی ادباء و شعراء کے سوانح حیات کو ان پرچوں میں نمایاں جگہ دی جاتی۔ ان کے ادبی نظریات پر روشنی ڈالی جاتی۔ اور ان کے کلام سے ان پر استدلال پیش کیا جاتا۔ مقامی شعراء اور ادباء جیسے طٰہٰ حسین، محمد حسین ہیکل، عقاد، اور مازنی وغیرہم کے شعر و ادب کے بارے میں جو تصورات اور نئے تاثرات ہوتے وہ ان پرچوں میں برابر پہنچتے رہتے۔ اس جد و جہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسل کے شعراء نے ادب عربی اور ادب مغربی دونوں ادبی سرچشموں سے اپنے کلام کی آبیاری کی اور اپنے لیئے ایک مستقل ادبی راستہ بنا لیا، چنانچہ اس نئی پود کے ہاتھوں جس قسم کا شعری ادب پیدا ہوا اس کے بارے میں آپ ڈاکٹر شوقی صاحب کے الفاظ سنیں وہ فرماتے ہیں:

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور کی ہماری شاعری میں ایک جاندار اور بارآور ارتقاء ہوا۔ ایک ارتقاء جس نے شعر کے ہر پہلو پر اثر ڈالا ہے، چاہے وہ شعر کا موضوع ہو یا اس کی شکل اور یا اس کی بناوٹ۔"
>
> (عربی سے ترجمہ)

جدید عربی شاعری کے عوامل و ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ مزید فرماتے ہیں:۔

> "یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ ہمارے شعراء نے مغربی ادبوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے اشعار کی بعض شکلوں میں ان سے استفادہ بھی کیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو مغربی ادب میں بالکل ضم نہیں کر دیا بلکہ اپنی مستقل عربی شخصیت برقرار رکھی، ایسی شخصیت جو اپنے حال کو اپنے ماضی سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتی ہے اور اس میں ایسا ارتقاء بھی چاہتی ہے جو اس کے زمانے کے موافق ہو۔ ایک ایسا ارتقاء جس کی تہوں میں ہم اپنے آپ کو بھی دیکھتے ہوں اور اپنے اسلاف اور ان کے ذہنی رجحانات کو بھی۔"

## آزاد نظم

اس نئی نسل والوں میں سے کچھ شعراء نے "الشعر المرسل" یا آزاد نظم کی سادگی اور پرکاری پر فریفتہ ہو کر اس کی طرف بھی توجہ کی۔ بعض ادباء نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور بعض نے اس ادبی بدعت کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، ابھی یہ تجربہ جاری ہے اس کی موت و زیست کا فیصلہ مستقبل کے ہاتھوں میں ہے۔ عباس محمود العقاد مرحوم جو مصر کے چند چوٹی کے ادباء اور ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا تو وہ مسکرائے اور بولے۔

"یہ شعر نہیں ہے۔ شعر کے لیئے وزن اور موسیقیت ضروری ہیں اور اس کے بارے میں صحیح فیصلہ کے لیئے ماہرین انشا پردازی

کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے۔"

اسی طرح جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین صاحب سے آزاد نظم کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کی تبدیلی اور شعراء کے ماحول کے تغیر کے ساتھ شعر کے اوزان بھی نئے پیدا ہوتے ہیں، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم خلیل فراہیدی کے مقرر کئے ہوئے وزنوں کو برقرار رکھیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان جدت پسند شعراء کی آزادی میں مخل نہ ہوں اور ان سے صرف دو چیزوں کا مطالبہ کریں۔ اول یہ کہ ان کی عربی صحیح عربی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اشعار میں کچھ کہیں بھی۔" (عربی سے ترجمہ)

عہد جدید کی عصری شاعری کے ارتقاء پر اس مختصر روشنی ڈالنے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نئے دور کے شعراء کے کلام کا کچھ نمونہ بھی پیش کیا جائے جس سے عملی طور پر انکا ادبی رجحان اور فنی مقام معلوم ہو سکے۔

## سوڈانی شاعر، نظم

۱۔ جعفر حامد البشیر، یہ ایک سوڈانی شاعر ہیں۔ ۳۵۔ ۳۶ سال سے زائد عمر نہ ہوگی عنفوان شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیئے۔ ابتدا میں متقدمین کے طریقہ پر وزن و قافیہ کے پابند تھے۔ لیکن بعد کو آزاد نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کا ایک دیوان "حریۃ و جمال" کے نام سے شائع ہوا جس میں ان کے صرف وہ قصیدے شامل ہیں جو انہوں نے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان میں کہے ہیں؛ ان کی ایک چھوٹی سی نظم جو "اسقنی" (پلا مجھکو) کے عنوان سے ہے۔ یہاں نقل کی جاتی ہے جسے پڑھ کر حافظ کی سرمستی اور خیام کی رندی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

اسقنی من خمور تلك العیون
وأدر من کؤوس سحرها کل جبین
مجھے اپنی آنکھوں کی شراب پلا اور بار بار
اس کے پیالے پر پیالے دیتا جا
استقیها من یصد عن خمرة الدنان
ویروی من خمرة فی الجبین
اسے بھی یہ شراب پلا دے جو اس مٹکے کی
پینا نہیں چاہتا اور صہبائے جبیں کے پیمانوں
سے سرمست ہے۔
اسقنیها یا مدهش الحسن صرفاً
من هیام ومن جوی وفتون
اے حسن مدہوش رہا مجھے وہی شراب پلا جو جنون عشق
سوز دروں اور فتنہ سامانی کی نتھری ہوئی ہے۔
اسقنیها ولا تضن فإنی
لیس بنافی من الهوی بضنین

مجھے وہی شراب پلا اور بخل نہ کر اس لیے کہ
میں بھی تو اپنے متاع شوق کے لٹانے میں
بخیل نہیں ہوں۔

یا عجیب الجمال إن عجیبا
أن تری لوعتی وترضی جنونی

اے حسن عجب خیز! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ تو
میرا سوز عشق دیکھے اور میرے جنون سے لطف اندوز ہو!

هذه بهجتی تذوب من الشوق
وقلبی یدمی لفرط الحنان

ذرا یہ تو دیکھ کہ میری روح آتش شوق سے
پگھلی جا رہی ہے اور میرا دل شدت عشق سے
خون ہوا جاتا ہے۔

اذ ترن الاوتار تسبح روحی
فتناجیک فی صفاء الرنین

جب کبھی سازوں میں جھنکار ہوتی ہے۔ میری
روح تھرکنے لگتی ہے اور پھر اس تیز جھنکار کے
درمیان میں تجھ سے سرگوشی میں محو ہو جاتی ہوں۔

(وترف الانوار تشرق نفسی
عند ذکراک فی ظلام الشجون

یا جب کبھی روشنیاں بھڑکتی ہیں تو میری روح
تجھے یاد کر کے غموں کے اندھیرے میں منور ہو جاتی ہے۔

او تفوح الأعطار ینشق قلبی
منک عرفا احلی من الیاسمین

یا جب کبھی خوشبوئیں پھیلتی ہیں تو میرا دل
تیری اس خوشبو سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے
جو چنبیلی کے پھولوں سے بھی زیادہ شیریں ہے۔

ملهم الشعر هذه درر الشعر
تبادت من کل خفقة ثمین

اے شعر کے القا کرنے والے! یہ اشعار کے وہ

آبدار موتی ہیں جو قیمتی سے قیمتی ہار پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔

أنت أوحيتها و أنت معيني
فتدفق بوحيه، يا معيني

تو ہی نے مجھے یہ اشعار القا کئے اور تو ہی میرا سرچشمہ ہے اسلئے اے میرے سرچشمے تو اپنا فیض القا برابر جاری رکھ۔

وانا الشاعر الذی نزہ الحسن
ونقی أوصافه من مجون

میں وہ شاعر معجز بیان ہوں جس نے حسن کو جلا دی اور اس کے اوصاف کو رکاکت سے پاک کیا۔

## عراقی شاعرہ

۲- اسی طرح عراق کی ایک منجھی ہوئی پختہ کار جدید شاعرہ ہیں جن کا نام ہے نازک الملائکہ۔ یہ اپنے ملک میں آزاد نظم کی تکنیک اور اس پر تنقید و تبصرہ کے فروغ دینے والوں میں پیشرو سمجھی جاتی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں بغداد میں پیدا ہوئیں۔ ماں اور باپ دونوں شاعر تھے چنانچہ شعر و شاعری کی فضا میں پرورش پائی۔ مقامی تعلیم سے فراغت کرکے انگریزی ادب کے مطالعہ کے لئے امریکہ گئیں۔ وہاں سے واپس ہوکر بغداد کے ٹریننگ کالج میں ادب عربی کی پروفیسر مقرر ہوئیں۔ ۱۹۵۸ء میں فوجی انقلاب کے بعد جب ملک میں اشتراکی رجحانات نے غلبہ پایا تو وہ کالج سے علیحدہ کردی گئی تھیں۔

نازک الملائکہ کے تین دیوان شائع ہوچکے ہیں۔ پہلا "عاشقة الليل" ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ دوسرا "شظایا ورماد" ۱۹۴۹ء میں اور تیسرا "قرارة موجة" ۱۹۵۷ء میں۔ ان کے ایک قصیدے میں سے جس کا عنوان ہے "جامعة الظلال" (دھندلکوں کو اکٹھا کرنے والی) ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

أخيرًا لمست الحياة
وأدركت ماهي ـــ اى فراغ ثقيل
أخيرًا تبينت سر العقائق والخيبات
وأدركت أني أضعت زمانا طويل
ألم الظلال ولا شئ غير الظلال
وسرت على ليالى
وها أنا أدرك أني لمست الحياة
وإن أصرخ واخيبتاه
ومر على زمان بطيئ العبور
وتائقه تمطى ملا لأكان العصور

هنالك تعفو وتنسى مواكبها ان تدور
زمان شد بين السواد ولون النجوم
يذكرني بعيون الذئاب
وضوء صغير يلوح وراء الغيوم
عرفت في النهاية لون السراب
ووهم الحياة
فواخيبتاه

وآخر کار میں نے زندگی کو چھو کر دیکھا،
اور مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کیا ہے ـــــ بڑ جھل خلا
اور پھر مجھے خوستوں کا راز معلوم ہوگیا، ہائے مری محرومی
اب مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ایک طویل زمانہ ضائع کیا،
دھندلکے اکٹھا کرتی رہی اور محالات کی تاریکی میں بھٹکتی رہی
میں دھندلکے اکٹھا کرتی رہی، صرف دھندلکے
اور مجھ پر راتوں پر راتیں گزرتی رہیں
اب میں محسوس کرتی ہوں کہ زندگی سے قریب ہوگئی ہوں
اگرچہ چیخ چیخ کے کہتی بھی جاتی ہوں۔ ہائے مری محرومی
پرسست رفتار زمانہ مجھ پر اس طرح سے گزرا
کہ اکتاہٹ کی وجہ سے اس کے لمحے اتنے لمبے ہوگئے جیسے کہ
طویل صدیاں
جو سوگئی ہوں اور جن کا جلوس آگے بڑھنا بھول گیا ہو۔
انتہائی تاریک زمانہ، اور تاروں کی چمک
مجھے بھیڑیوں کی آنکھیں یاد دلاتی ہے
اور ایک مدھم روشنی بادلوں کے اس پار ٹمٹما رہی ہے
آخر میں میں نے رنگ سراب پہچانا
اور فریب زندگی بھی
ہائے مری محرومی!)

## شام کے مشہور شاعر

۳ - نزار القبانی۔ شام کے ایک مشہور شاعر ہیں، سنہ ۱۹۲۳ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر ہی سے اشعار کہنا شروع کر دیئے تھے لیکن روایاتی شاعری پسند آئی۔ اس لئے زیادہ دنوں ایسی شاعری سے وابستہ نہ رہ سکے۔ جو اوزان قوافی میں مقید ہو

آزاد نظموں میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ ابھی زیادہ عمر نہ ہونے کے باوجود پانچ دیوان شائع ہو چکے ہیں سب سے پہلا دیوان ۱۹۴۲ء میں "قالت لی السمراء" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

سفارت خانہ کی ملازمت سے وابستہ رہنے کی وجہ سے نزار القبانی کو تقریباً پورے یورپ کی سیاحت کا موقع ملا۔ ۱۹۵۵ء میں جب وہ اسپین پہنچے تو وہاں کی سیر سے جو تاثرات ان کے دل میں پیدا ہوئے انھوں نے نظم کا جامہ پہن لیا اس نظم کا ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:

في اسبانيا ........ لم احتج إلى دواة ........
ولا إلى حبر ...... أسقي به عطش الورق ........
عيون موريتا روساليا ......
مترشئ بالشوق الاسود ........
عيون موريتا روساليا .......
دواة سوداء ....
اغطسها ......... ولا أسأل
وتشرب حياتي ..... ولا تسأل
كصدفة بحرية ....... معاشة ....
كهودج عربي .... يحفر مصيره في الابعاد ......
يحفر مصيره ... في مصيري ...

اسپین میں مجھے ..... دوات کی حاجت نہیں ہوئی
نہ روشنائی کی ..... کہ بجھاؤں اس سے کاغذ کی پیاس ...
چشمہائے روسالیا
شوق سیاہ سے نہلاتی رہیں مجھے
چشمہائے روسالیا
دوات ہیں سیاہی کی
ڈوب جاتا ہوں ان میں ..... کچھ پوچھتا نہیں
سیراب ہوتی ہے زندگی میری ..... کچھ پوچھتی نہیں
جیسے ایک سمندری سیپ ...... بڑا ....
جیسے ایک عربی محمل .... تلاش کرتا ہے محمل مسافتوں میں
تلاش کرتا ہے منزل ...... مری منزل کے درمیان ...

## نوخیز شاعرہ - لیلیٰ

۴- لیلیٰ جو مکہ معظمہ کے مدرستہ الفلاح کے مہتمم سید اسحٰق عزوز کی صاحبزادی ہیں۔ حجاز کی ایک نوخیز شاعرہ ہیں۔ اس وقت

بیس اکیس سال کی عمر ہوگی۔ ادبی ذوق اپنے باپ سے ورثہ میں پایا۔ گھر کے کتب خانہ اور دوسری باہر کی کتابوں کے مطالعہ نے اس ذوق کو اور جلا دی۔ بہت ہی کم عمری سے اشعار کہنا شروع کر دیئے جو مکہ کے روزنامہ "الندوۃ" میں رواق السیدات" کے مخصوص صفحہ پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ موصوفہ کا ایک چھوٹا سا قصیدہ اب سے تقریباً چھ سات سال پہلے کا کہا ہوا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

فتا ة عروبتنا أسرعي
لركب الحياة ولا ترجعي
اے دنیائے عرب کی دوشیزہ
کاروانِ زندگی کی طرف بڑھو اور پیچھے نہ ہٹو
هلمي إلى حاضر مشرق
وفي ظلمة الليل لا تهجعي
چمکتے ہوئے عہد حاضر کی طرف بڑھ
اور رات کے اندھیرے میں غافل مت ہو
تفاني لإرجاع ما قد مضى
وروي الفؤاد به واجرعي
عظمت ماضی کو واپس لانے کے لئے اپنے کو
مٹا دے اور اسی سے اپنے دل کو برابر سیراب کر۔
ولا تصبحي صورة قد بدت
تماثيل أشيا جمالا تعي
تو ایسی تصویر نہ بن جو مورتیوں کی طرح
نظر آئے اور شعور سے بیگانہ ہو
فإن الزمان زمان العلا
فسيري إلى الهدف الألمع
اس لئے کہ یہ زمانہ سبقت کا زمانہ ہے
لہٰذا تو بھی اپنے روشن مقصد کی طرف بڑھ
أرى الكل ذاق رحيق الحيا
ة وخاض الغمار ولم يقنع
میں دیکھتی ہوں کہ سب کے سب شراب زندگی پی چکے ہیں
اور اس کی گہرائیوں میں غوطے لگا چکے ہیں اور پھر بھی بس نہیں کرتے۔
وأنت تذوقين مر الحيا
ة أما تنظرين إلى المطلع

اور تیری حالت یہ ہے کہ زندگی کی تلخیاں پی رہی ہے
کیا افق درخشاں پر تیری نگاہ نہیں جاتی ؟

فهبی یا ابنة المجد وا ستیقظی
لسداعی الفلاح ولا تجزعی

جاگ اے دختر شرف جاگ، فلاح کی آواز پر لبیک کہہ اور ناامید مت ہو۔

وهیا اتشعی عنك تلك الغیو
م بعزم وجد ولا تفزعی

بڑھ اور اپنے پاس سے ان بادلوں کو عزم و قوت کے ساتھ دور کر دے اور ذرا بھی مت ڈر۔

## نثر کا ارتقاء

جدید عربی ادب میں نثر کے ارتقا کی بھی کم و بیش اسی قسم کی کہانی ہے جو نظم کی ہے جسکی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس نئے دور سے پہلے جو ایک بناوٹی اور نمائشی اندر سے کھوکھلا ظاہر میں بھڑکیلا، دقیق اور مشکل الفاظ میں بوجھل نثری اسلوب رائج تھا اب اسکی جگہ ایک جاندار اور طاقتور مگر سہل و سادہ اسلوب نے لے لی ہے اور اسی کیساتھ ساتھ نئے اصناف نثر مثلاً مقالہ، قصہ، اقصوصہ (شارٹ اسٹوری) اور ڈرامہ (نثری) وجود میں آچکے ہیں نثر کی اس ارتقائی جدوجہد میں نمایاں حصہ لینے والوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ محمد عبدہ، ابراہیم المویلحی محمد المویلحی، ناصیف الیازجی، ابراہیم الیازجی، احمد فارس الشدیاق بطرس البستانی، شہاب الدین الآلوسی، محمود شکری الآلوسی، مصطفیٰ لطفی المنفلوطی، احمد لطفی السید، ابراہیم عبد القادر المازنی، جرجی زیدان، جبران خلیل جبران سلامہ موسیٰ، محمد حسین ہیکل، طہ حسین، توفیق الحکیم، محمود تیمور، رضا الشبیبی، ذون النون ایوب وغیرہم۔

اس عہد جدید میں نثر کی ارتقاء کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ صرف بچوں کے لیئے جو قصے کہانیاں یا دوسری کتابیں لکھی گئی ہیں انکا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ ادب عربی میں اکٹھا ہو گیا ہے۔ اس سے قبل اخبار و رسائل میں "رکن الاطفال" یا اسی قسم کے دوسرے عنوانوں کے تحت بچوں کیلئے قصے، کہانیاں، لطیفے اور دوسرے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے اور جواب بھی بعض اخبار و رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچوں کی قوت عقلی میں اضافہ ہو اور وہ آسانی سے زبان بھی سیکھتے جائیں یہاں تک کہ انھیں زبان و ادب سے گہری دلچسپی پیدا ہو جائے۔ عام طور سے اخبارات و رسائل کے یہ کالم جلی حروف میں ہوتے، زبان سہل و سادہ ہوتی، مضامین ہلکے پھلکے اور تفریحی ہوتے لیکن زیادہ تر اسکا خیال رکھا جاتا کہ جو بھی مضمون ہو اسکا بچوں کے طبائع و کردار پر ایک صحتمند اثر پڑے۔

## بچوں کا ادب

تقریباً تیس پینتیس سال سے بچوں کے ادب کی اب مستقل کتابیں لکھی جانے لگی ہیں۔ اس قسم کے لکھنے والوں میں غالباً سب سے پہلا نام کامل کیلانی مرحوم کا ہے۔ اگر انھیں اس صنف ادب کا امام کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ انہوں نے بہت سی کتابیں الگ الگ مختلف عمر کے بچوں کیلئے لکھی ہیں جنکی تعداد سو سوا سو سے کم نہ ہوگی جو کتابیں بہت ہی کم عمر بچوں کے لیئے لکھی ہیں ان کی زبان انتہائی سہل و سادہ ہے اور مضامین بھی روزمرہ کے مشاہدات اور گھریلو معاملات سے متعلق ہیں۔ ان کتابوں میں کامل کیلانی نے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے اس میں ایک نیا پن ہے۔ انہوں نے ایک ہی جملے کے چند الفاظ بدل کر بار بار اسے دُہرایا ہے اور اس سے ایک نیا مفہوم پیدا کر لیا ہے۔ اس اسلوب سے بچے کو کتاب پڑھنے میں دشواری نہیں ہوتی اور وہ شوق و ذوق سے پڑھتا ہے۔

کامل کیلانی کے اس سلسلہ کی جو کتابیں بڑے بچوں کے لیئے ہیں ان میں ایک جملہ کو بار بار دُہرانے کا طریقہ نہیں اختیار کیا گیا ہے لیکن

زبان انکی بھی سہل و سادہ رکھی گئی ہے اور موضوع کے اعتبار سے یہ کتابیں تاریخی اور علمی، سنجیدہ اور مزاحیہ سب ہی طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان قصوں اور کہانیوں میں بعض طبعزاد ہیں۔ کچھ لیٹے یہاں کے مشہور قصے ہیں اور کچھ دوسری زبانوں سے ترجمے اور اقتباسات۔

کامل کیلانی کے علاوہ اور دوسرے ادیبوں نے بھی اس طرف توجہ کی اور اس طرح سے بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں ان ادیبوں میں سے چند کے نام یہ ہیں، محمد عاطف البرقوقی، محمد سعید العریان، محمد احمد برانق، محمود زہران، محمد عطیہ الابراشی وغیرہم بچوں کی کتابوں کا یہ ذخیرہ بھی جدید عربی ادب کا ہی ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ان بچوں کے لئے مستقل پرچے نکل رہے ہیں جن سے روز بروز اس سرمایہ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر قاہرہ سے "سمیر" اور "سندباد" نکل رہے ہیں۔ یہ دونوں ہفتہ وار پرچے ہیں جس عمدہ کاغذ پر رنگین تصویروں کے ساتھ شائع ہوتے ہیں وہ دیدہ زیبی کی آپ اپنی مثال ہیں۔


سالنامہ ۱۹۶۴ء

# تذکروں کا تذکرہ نمبر

جس نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کیا ہے کہ

تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے؟

اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں؟

تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا؟

اردو، فارسی میں آجتک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں؟

ان تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے؟

ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے؟

ان سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے؟

ان تذکروں میں اردو، فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے؟

یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے؟

ضخامت:- ۳۲۰ صفحات　　قیمت:- چار روپے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

# عبداللہ بن سبا اور قتلِ حضرت عثمانؓ

## (عہد عثمانی پر ایک سرسری جائزہ)

نیاز فتحپوری

گزشتہ اشاعت میں جناب پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کا ایک مقالہ "عبداللہ بن سبا" پر شائع ہو چکا ہے جس پر میں نے اپنی رائے محفوظ رکھی تھی، کیونکہ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ لکھنا تھا وہ زیادہ تفصیل کا محتاج تھا اور اسے میں نے اشاعت حاضرہ پر موقوف رکھا تھا۔ چنانچہ اس وقت میں اس مسئلہ کے بعض ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن پر فتنۂ عہد عثمانی کے سلسلہ میں کم غور کیا جاتا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ جب قتل حضرت عثمان کا ذکر آتا ہے تو سب سے پہلے عموماً "عبداللہ بن سبا" کا نام لیا جاتا ہے اور اس تفصیل و انہماک کے ساتھ اس پر گفتگو کی جاتی ہے، گویا "قتل حضرت عثمان" کا تنہا ذمہ دار وہی تھا اور اگر وہ نہ ہوتا تو شاید یہ المناک حادثہ پیش نہ آتا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا ہوتا یا نہ ہوتا، یہ انقلاب تو ہونا تھا اور اس انقلاب کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو حضرت عثمان قتل کر دیے جاتے یا بنو ہاشم کے بے شمار افراد جن میں حضرت علی بھی شامل تھے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتے۔

اس گفتگو کے سلسلہ میں لوگ عموماً عہد عثمان ہی کو سامنے رکھتے ہیں اور ان دیرینہ قبائلی اختلافات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ہر چند رسول اللہ کے عہد سعادت میں تو بظاہر ختم ہو گئے تھے، لیکن رحلت نبوی کے بعد ہی یہ راکھ پھر دھواں دینے لگی اور حضرت عثمان تک پہونچتے پہونچتے اس نے شعلوں کی صورت اختیار کر لی۔

رسول اللہ کی رحلت کے بعد جب جانشینی رسول اللہ کے باب میں مہاجرین و انصار کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو حضرت ابو بکر کا بحوالہ حدیث نبوی یہ کہکر کہ امامت قریش کا حق ہے (ہر چند میں اس حدیث کو صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ رسول اللہ کا مقصود صحیح معنی میں انسانی مساوات پیدا کرنا تھا اور وہ حق امامت کو نہ قریش کے لئے مخصوص کر سکتے تھے اور نہ اپنے خاندان والوں کے لئے) انصار کو تو امامت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا لیکن بنو ہاشم اور بنو امیہ کی دیرینہ جذبۂ رقابت کو ایک حیثیت سے ابھار بھی دیا۔ کیونکہ آل قریش میں بنو ہاشم اور بنو امیہ دونوں شامل تھے اور اس حدیث کی رُو سے بنو امیہ کو حق امامت سے محروم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس لحاظ سے کہ رسول اللہ اور حضرت علی دونوں کا تعلق بنو ہاشم سے تھا، نفس جذباتی حیثیت سے بنو ہاشم کو بنو امیہ کے مقابلہ میں زیادہ مستحق خلافت سمجھا گیا پھر اس کو محض حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کا تصرف قرار دیجئے یا رسول اللہ کی تعلیم اخوت و مساوات کے اثرات (جو ہنوز محو نہ ہوئے تھے) کہ بنو امیہ اُس وقت تو خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے، اور بنو ہاشم کے اقتدار کو فوراً چیلنج نہ کر سکے، لیکن جب بعد میں رفتہ رفتہ تعلیمات نبوی کے اثرات ضعیف ہونے لگے اور شیخین کی سخت گیر پالیسی بھی ختم ہو گئی، تو حضرت عثمان کے عہد خلافت میں (چونکہ وہ خود بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے) امویین کو حساب فہمی کا موقع مل گیا اور خلافت و امارت کا وہ تمام نظام جو حضرت عمر نے قائم کیا تھا۔ درہم برہم ہو گیا۔ اور اس طرح رسول اللہ کی رحلت کے تیرہ سال بعد ہی اسلامی جمہوریت نے اقتدار و اشراف کی بگ لیلی اور پھر امیر معاویہ کے عہد میں وہ مستقلاً ملوکیت و استبداد شخصی میں تبدیل ہو گئی۔

لیکن دشواری یہ ہے کہ جب ہم حقائق تاریخی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہمارے مذہبی یا نیم مذہبی معتقدات ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہم سرے سے واقعات ہی کے منکر ہو جاتے ہیں یا ان کی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے اپنے معتقدات کے دائرہ میں لے آتے ہیں۔ مثلاً اہل السنت والجماعت کو لیجئے کہ ان کا یہ عقیدہ کہ خلفاء راشدین سے کسی غلطی کا ارتکاب ممکن ہی نہ تھا یا اہل تشیع کا یہ عقیدہ کہ پہلے تین خلفاء چونکہ ناجائز خلیفہ تھے اس لئے انھوں نے جو کچھ کیا وہ سب غلط و نادرست تھا، مذہب کا جزو ہو کر رہ گئے ہیں اور کوئی بات اپنے مزعومات کے خلاف سننا ہی نہیں چاہتے ——— پھر اس باب میں تو میں حضرات شیعی کو ایک حد تک معذور سمجھتا ہوں، کیونکہ غلط یا صحیح ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر قائم ہے کہ رسول اللہ کی نیابت منصوص ہو چکی تھی صرف حضرت علی اور جناب فاطمہ کی اولاد کے لئے اور اس وراثتی خلافت و امامت سے ہٹ کر کسی اور جمہوری یا غیر جمہوری حکومت کا تصور ان کے ذہن ہی میں نہ آسکتا تھا اور پہلے تین خلفاء کو ناجائز خلیفہ قرار دینا ان کا مذہبی مطالبہ ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے اہل سنت پر کہ انھوں نے بھی مسئلہ خلافت کو اپنے مذہب کا ضروری جز قرار دیدیا ہے یہانتک کہ عہد خلافت راشدہ پر وہ کسی نقد و جرح کو گوارا نہیں کر سکتے اور انھوں نے ایک عام اصول یہ مقرر کر لیا ہے کہ جس شخص کو صحابی ہونے کا فخر حاصل ہو چکا ہے وہ کبھی کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا یہانتک کہ حضرت عثمان تو خیر، بڑے بلند مرتبہ و صالح کردار کے انسان تھے، وہ امیر معاویہ پر بھی کسی نکتہ چینی کو گوارا نہیں کرتے محض اس لئے کہ وہ صحابی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی غلط ذہنیت ہے اور اسی ذہنیت نے وضع احادیث کا دروازہ کھولدیا اور تاریخ اسلام مسخ ہو کر رہ گئی حالانکہ نفس مذہب نہ صحابہ سے تعلق رکھتا ہے اور نہ مسئلہ خلافت سے۔ اگر خلفاء اربعہ میں سے کسی کا وجود نہ ہوتا تو بھی اصول اسلام وہی رہتے جو رسول اللہ منضبط فرما گئے تھے اور اگر آج کوئی ان کی قیادت و سیادت پر نقد و جرح کر کے ان کی غلطیوں پر گفتگو کرے تو بھی آپ اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کر سکتے، کیونکہ شرائط اسلام میں یہ بات شامل نہیں کہ خدا اور رسول کے ساتھ خلفاء و صحابہ پر بھی ایمان لایا جائے۔ رسول اللہ کی ذات یقیناً عہد آفریں ذات رکھتی لیکن ان کی رحلت کے بعد دور شروع ہو گیا محض تاریخ اسلام کا جس کا تعلق قطعاً مذہب سے نہ تھا۔ اور اسی حیثیت سے اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اس میں شک نہیں کہ عہد خلافت کا وہ دور جو حضرت عثمان سے شروع ہوا تاریخ کا بڑا اہم موڑ تھا اور اس کے اسباب و نتائج پر بھی تاریخی حیثیت ہی سے گفتگو کرنا چاہئے۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ اس عہد میں تو کوئی تاریخ مرتب ہوئی نہیں اور بعد کی کتب تواریخ اس لئے ناقابل اعتماد ہیں کہ ان کی حیثیت زیادہ تر فرقہ وارانہ لٹریچر کی سی ہے اور ان سے حقیقت کا پتہ چلانا آسان نہیں۔ تاہم اخذ نتائج کا ذریعہ چونکہ صرف یہی مسخ شدہ روایات ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں کہ جہانتک ممکن ہو خود عقل و درایت سے کام لے کر کھرے کھوٹے کا فیصلہ کریں اور صرف ان واقعات کو سامنے رکھیں جن کا تعلق محض ان کے حدوث سے ہے تاویلات سے نہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا حضرت عثمان کا دور خلافت تاریخ کے ایک بڑے اہم موڑ کا آغاز تھا۔ ہر چند اس کی بعض تفصیلات جو مورخین نے بیان کی ہیں وہ بالکل منقح و بے لاگ نہیں ہیں، تاہم ان میں بعض ایسے ٹھوس واقعات ضرور مل جاتے ہیں جن سے اختلاف ممکن نہیں اور انھیں کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا مفید مطلب ہو سکتا ہے۔ مثلاً انھیں واقعات میں سب سے ——— بڑا اہم واقعہ جس سے انکار ممکن نہیں وہ قتل عثمانؓ کا واقعہ ہے اس لئے سب سے پہلے ہم کو اس کے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس باب میں جو کچھ مورخین مابعد نے لکھا ہے اس کا تعلق زیادہ تر شخصیات سے ہے، اور نفسیاتی حیثیت سے اس پر کم غور کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جماعت جو زیادہ تر حضرت عثمان کی طرفدار ہے، وہ اس المناک واقعہ کا تنہا ذمہ دار عبداللہ بن سبا اور اس کی منافقانہ سازشوں اور سرگرمیوں کو قرار دیتی ہے۔ حالانکہ یہ نقطہ نظر میرے نزدیک صحیح و درست نہیں۔ اول تو عبداللہ بن سبا کا وجود ہی معرض بحث ہے۔ چنانچہ چند سال اس طرف کی بات ہے کہ بیروت کے ایک

محقق نے اسی موضوع پر ایک رسالہ لکھکر اسکے وجود کو بالکل وہمی و فرضی چیز قرار دیا تھا۔ اسی طرح طبقات ابن سعد میں بھی اس کا ذکر نظر نہیں آتا۔ بلاذری نے بھی اپنی تصنیف انساب الاشراف میں، اس کا نام نہیں لیا۔ سب سے پہلے طبری نے بہ حوالۂ سیف بن عمر، عبداللہ بن سبا کا ذکر کیا اور پھر مورخین مابعد نے اسے اور زیادہ اچھالا۔ تاہم اگر اس کا وجود تھا بھی تو وہ اتنا اہم نہ تھا کہ حضرت عثمان کے قتل اور ان کے عہد کے تشتت و انتشار کا ذمہ دار تنہا اسی کی ذات کو قرار دیا جائے۔

عبداللہ بن سبا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چونکہ وہ ایک منافق نو مسلم یہودی تھا اس لئے دین میں فساد پھیلانے اور جمعیت اسلامی میں انتشار پیدا کرنے کا آغاز اسی نے کیا۔ پہلے وہ بصرہ گیا، وہاں سے نکالا گیا تو شام آیا، یہاں ابوذر غفاری، کو اپنا ہمنوا بنایا اور پھر جب عبادہ بن الصامت اسے امیر معاویہ کے پاس لے گئے اور یہاں بھی اس نے شر و فساد کی باتیں شروع کیں تو امیر معاویہ نے اسے شام سے نکال دیا اور وہ مصر چلا گیا۔ یہاں اس کو فضا زیادہ سازگار ملی اور تخریب دین کے لئے یہاں اس نے یہ نعرہ بلند کیا کہ حضرت عیسیٰ کی طرح رسول اللہ کو بھی اس دنیا میں پھر لوٹ کر آنا ہے جیسا کہ قرآن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ "ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد" (معاد کا مفہوم اس نے یہی عالم آب و گل قرار دیا) اسی کے ساتھ اس نے یہ تبلیغ بھی شروع کی کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوا ہے اور رسول اللہ کے وصی حضرت علی تھے اس لئے حق خلافت رسول اللہ کے بعد انھیں کو پہونچتا تھا اور "شیخین" و حضرت عثمان کی خلافت بالکل غلط و ناجائز تھی۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی خفیہ جماعتیں بھی قائم کیں اور رفتہ رفتہ اس کا رسوخ اتنا بڑھ گیا کہ مصر کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو گئی اور اس نے حضرت عثمان کے خلاف دھاوا بول دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کے متعلق یہ تمام بیانات بہت مشتبہ ہیں اور یہ محض پروپاگنڈا تھا امویین و عباسیین کا علویین اور اہل تشیع کے خلاف جو بہت بعد کو عمل میں آیا۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت عثمان کے خلاف لوگوں میں برہمی ضرور پائی جاتی تھی اور اہل مصر کی یلغار سے پہلے ہی خود مدینہ اور کوفہ میں ان کے مخالفین کافی پیدا ہو گئے تھے اس لئے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ حضرت عثمان کی مخالفت سب سے پہلے کب اور کہاں شروع ہوئی، بلکہ صرف یہ کہ اس کے اصل محرکات کیا تھے۔

اس سے قبل ہم بنو ہاشم اور بنو امیہ کی باہمی جذبۂ رشک و حسد کا ذکر کر چکے ہیں، جو رسول اللہ کی زندگی اور اس کے بعد خلافت شیخین کے زمانہ میں تو یہ جذبہ دبا رہا، لیکن جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو بنو امیہ کا یہ جذبہ ابھر آیا۔

ہر چند یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ خود حضرت عثمان میں بھی بنو ہاشم کے خلاف وہی جذبۂ رشک و حسد پایا جاتا تھا جو دوسرے افراد بنی امیہ میں، لیکن اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان کے طرز عمل نے خواہ اُسے نرم دلی کہئے یا اجتہادی غلطی اس جذبہ کو بڑی تقویت پہونچائی اور بنو امیہ کے دنیاوی عروج کو دیکھ کر اکثر صحابہ اور افراد بنو ہاشم حضرت عثمان کے خلاف ہو گئے۔ کسقدر عجیب بات ہے کہ ابو سرح جو رسول اللہ کا جانی دشمن تھا اور جسے رسول اللہ یقیناً قتل کرا دیتے۔ اگر حضرت عثمان سفارش نہ کرتے، اسے امراء کی صف میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ وہ حضرت عثمان کا رضاعی بھائی تھا۔ اسی طرح ولید بن عقبہ جس کے باپ کو جنگ بدر کے بعد رسول اللہ نے قتل کر دیا تھا اور جہنمی ہونے کی بددعا کی تھی یا سعید بن العاص جس کا باپ بھی اسی لڑائی میں دوسرے کفار کے ساتھ مارا گیا تھا۔ ان سب نے عہد عثمانی میں منصب امارت حاصل کیا اور ولید گورنر کوفہ کو باوجود اس شدید جرم کے کہ انھوں نے شراب پی کر امامت کی اور نماز میں غلط قرأت کی، صرف گورنری سے ہٹا دیا گیا اور حد شراب خواری جاری ہوئی بھی تو محض حضرت علی کے اصرار سے ورنہ وہ بھی ٹل جاتی۔ اسی طرح ابو موسیٰ کی جگہ ابن عامر کو گورنر بنایا گیا محض اس بناء پر کہ وہ حضرت عثمان کا قریبی رشتہ دار تھا۔ بہرحال حضرت عثمان کی یہ پالیسی کہ انھوں نے اپنے اعزہ و اقربا کو امارتیں سپرد کیں، بڑے بڑے شہر ان کے متقر رکھے، زر و مال جمع کر کے انھیں صاحب املاک اور دولتمند ہونے کا موقع دیا۔ یقیناً نہ صرف صحابہ بلکہ تمام بنو ہاشم کو ناگوار

گزری اور اگر کسی نے اس پر نکتہ چینی کی بھی مثلاً ابوذر غفاری نے تو ان کو خارج البلد کر دیا۔ اسی کے ساتھ احکام شریعت کی وہ سخت گرفت جو حضرت عمر کے زمانہ میں پائی جاتی تھی ان کے عہد میں بہت ڈھیلی پڑ گئی جس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ جب ابولولو حضرت عمر کو شہید کر دیتا ہے تو عبداللہ بن عمر اسے بھی قتل کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی دو محض سازش کے شبہ میں، ہرمزان کو بھی جو اسلام لا چکا تھا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت علی عبیداللہ بن عمر پر حد قصاص جاری کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو حضرت عثمان اس کی مخالفت کرتے ہیں، زرِ فدیہ اپنے پاس سے ادا کر کے عبیداللہ کی جان بچا لیتے ہیں اور جب شاعر زیاد بن لبید حضرت عثمان کے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اسے جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ ہرچند قتل ہرمزان کے سلسلہ میں حضرت عثمان کا عبیداللہ بن عمر کے قصاص کے عوض زرِ فدیہ ادا کر دینا، زیادہ تر اس مصلحت پر مبنی تھا کہ یہ بات لوگوں کو پسند نہ آئے گی کہ حضرت عمر کے قتل کے بعد ہی ان کے بیٹے کی بھی جان لی جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہی واقعہ حضرت عمر کی زندگی میں پیش آتا تو وہ کبھی درگزر نہ کرتے۔ بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں، احکام شریعت کے نفاذ میں زیادہ سخت گیری سے کام لینا حضرت عثمان کی فطری نرمی کے منافی تھا اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انھیں حق پہونچتا تھا کہ وہ اپنی رائے سے کسی سخت سزا کو زیادہ نرم سزا میں تبادل کر دیں۔ اگر اصول شریعت اس کی اجازت دے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مخالفت کا اصل سبب یہ مذہبی یا شرعی پہلو تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس کا اصل محرک وہی تقسیم دولت کا سوال تھا جس نے ہمیشہ اقوام عالم میں پھوٹ ڈالی ہے۔

رسول اللہ کے زمانہ میں تو اول اول دولت و ثروت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ نہ کوئی بیت المال تھا نہ خزانہ، جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا تھا وہ برابر تمام افراد میں تقسیم ہو جاتا تھا، یہی حال صدقات کی تقسیم کا بھی تھا۔ اس وقت ثروت و دولت نام تھا صرف مویشیوں کا جن کی تعداد عہد نبوی میں چالیس ہزار سے زیادہ نہ تھی، اس کے بعد جب زکوٰۃ فرض ہوئی سو اس سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی فقراء کی امداد اور غزوات میں صرف ہو جاتی تھی، بہرحال عہد نبوی میں تو دولت و ثروت کا کوئی تصور ہی نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

جب رسول اللہ کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو جو صورت تقسیم دولت کی عہد نبوی میں متعین ہو چکی تھی اسی کو بعینہٖ قائم رکھا گیا اور دولت جمع کرنے کا کوئی تصور اس وقت بھی پیدا نہیں ہوا، یہانتک کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو صرف ایک دینار آپ نے اپنے بعد چھوڑا، حالانکہ اسلام لانے سے قبل آپ خاصے مالدار تاجر تھے اور ۴۰ ہزار درہم کے سرمایہ دار، لیکن یہ ساری دولت آپ نے فقراء و غرباء میں تقسیم کر دی اور دوسرے معمولی لوگوں کی طرح اپنا روزینہ بھی بیت المال سے مقرر کرا لیا اور تجارت ترک کر دی حضرت عمر اس باب میں اور زیادہ سخت گیر تھے اور جب ان کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور نقد دولت کا انبار سامنے آیا تو اس وقت بھی حضرت عمر نے سنت نبوی کی پیروی میں مساوی تقسیم ہی پر عمل کیا۔ چنانچہ جب وقت ابوہریرہ، بحرین سے پانچ لاکھ درہم اپنے ساتھ لائے تو حضرت عمر نے لوگوں سے پوچھا کہ "اپنا اپنا حصہ تم لوگ کس طرح لینا چاہتے ہو۔ آیا میں اسے شمار کر کے بانٹ دوں یا تول تول کر۔"

حضرت عمر جذبۂ امارت کے سخت مخالف تھے اور اسی لئے انھوں نے عساکر اسلامی کو املاک خریدنے، مکانات تعمیر کرنے اور زراعت میں مشغول رہنے سے باز رکھا۔ اور جو امیر و عمال مقرر کئے انکی نگرانی بھی اتنی سختی سے کی کہ کسی کو دولت جمع کرنے کی ہمت نہ ہوئی ہرچند حضرت عمر کی یہ پالیسی کہ خزانہ خالی رکھا جائے اصول سیاست کے منافی تھی لیکن آپ نے اسکی مطلق پروا نہیں کی اور رسول اللہ کے طرز عمل سے سرمو انحراف نہیں کیا لیکن جب آپ کے بعد حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو عہد فاروقی کی سخت گیریاں ختم ہو گئیں، امراء و عمال کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کی گئیں، انھیں تجارت، زراعت اور حصول املاک کی اجازت دیدی گئی اور اس طرح افراد بنی امیہ رفتہ رفتہ بڑی دولت و ثروت کے مالک ہو گئے۔ امیر معاویہ کا مشاہرہ حضرت عمر کے زمانے میں صرف ایک ہزار دینار سالانہ تھا، لیکن عہد حضرت عثمان میں وہ خود ہزاروں دینار دوسروں کو انعام و اکرام میں دینے لگے، یہی حال دوسرے امراء و عمال کا بھی تھا اور چاروں طرف دولت کی بکھیر تھی، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ تر وہی افراد تھے جو بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے یا ان کے متوسلین — الغرض یہ تھی حضرت عثمان کی سیاسی و انتظامی حکمت عملی جس کی طرف سے کوفہ وغیرہ کے علاوہ خود مدینہ میں بھی بے چینی

پیدا ہو گئی تھی اور وہ صحابہ جو مدینہ میں مقیم تھے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے چنانچہ ان سب نے مل کر ایک بار حضرت علی سے کہا بھی کہ وہ حضرت عثمان کے پاس جاکر پوچھیں تو سہی کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت علی، ان کے پاس گئے اور بہت کھل کر صحابہ و عوام کی تمام شکایات بتائیں اور اسی کے ساتھ صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کا اپنے اقربا کے ساتھ غیر معمولی فیاضانہ سلوک کسی طرح مناسب نہیں لیکن حضرت عثمان نے حضرت علی کے اعتراضات کو تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ میں تو حضرت عمرؓ ہی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں اور اس سلسلہ میں امیر معاویہ کا بھی ذکر کیا کہ انھیں حضرت عمرؓ نے امارت دمشق پر مامور کیا تھا۔ حضرت علی نے کہا کہ یہ بات ٹھیک ہے لیکن حضرت عمر کے زمانہ میں تو معاویہ ایک غلام کی طرح ان سے کانپتے تھے۔ لیکن اب انھیں کس کا ڈر ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان کی طرف سے حکمت عملی کی طرف سے خود مدینہ کے اندر بھی بہت سے صحابہ ان کے مخالف ہو گئے تھے اور دوسرے صوبوں میں بھی امراء عثمانی کی دنیاوی شان و شوکت کے خلاف عوام کے دلوں میں سخت تنفر ہو چلا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان کے خلاف برہمی بڑھتی گئی۔ لیکن اس بحث کا ایک دوسرا پہلو بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ آیا حضرت عثمان کی سیاسی پالیسی کی بنیاد کسی جذبہ دنیاوی پر قائم تھی یا دینی جذبہ خدمت پر۔

حضرت عثمان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ مخلص انسان تھے۔ اور انھوں نے قبول اسلام کے بعد جو سختیاں جھیلیں اور اپنی دولت کو جس طرح بیدریغ خدمت اسلام پر صرف کیا، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار، اپنے جذبۂ ایثار و قربانی کے لحاظ سے کسی طرح دوسرے صحابہ سے کم نہ تھے، بلکہ دین کے مقابلہ میں دنیا کو ٹھکرا دینے کی جو مثال انھوں نے قائم کی، اس کی دوسری نظیر مشکل ہی سے پیش کی جا سکتی ہے۔ آپ کا شمار ان امراء عرب میں سے تھا جو اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے بڑے بلند مرتبہ کے انسان سمجھے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ کا لقب ہی غنی قرار پا گیا تھا۔ لیکن جب آپ کو دولت اسلام ہاتھ آئی تو اس پر اپنی تمام دنیاوی دولت قربان کر دی۔ اس لئے یہ تو ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ آپ لاکھ سرمایہ دار سہی، لیکن سرمایہ دارانہ ذہنیت آپ میں کبھی پیدا نہیں ہوئی، اور اگر آپ نے اپنے عہد خلافت میں افراد بنی امیہ کو حصول جاہ و ثروت کا موقع دیا تو اس کا سبب بھی یقیناً کسی جذبۂ دینی ہی سے متعلق ہوگا۔

حضرت عمر کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ تو وسیع پیمانہ پر شروع ہو گیا تھا، لیکن ان کی تکمیل ہنوز محتاج توجہ تھی، اس لئے حضرت عثمان نے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلے اسی کو مقصد اعظم قرار دیا اور اس خدمت کے انجام دینے کے لئے آپ نے افراد بنی امیہ ہی کا انتخاب کیا کیونکہ ان پر انھیں پورا بھروسہ تھا اور یہ اعتماد آپ کا غلط ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ منصب خلافت سنبھالنے کے بعد صرف چھ ماہ کی قلیل مدت میں آپ نے نہ صرف بغاوت ایران کا استیصال کیا، بلکہ افغانستان، ترکستان و خراسان کو بھی مملکت اسلام میں شامل کر لیا۔ آرمینا۔ آذربیجان اور ایشیاء کوچک پر تسلط قائم ہو گیا۔ قبرص فتح کیا، اسکندریہ واپس لیا اور سلطنت روم کے اقتدار کو نیست و نابود کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ابوذر غفاری وغیرہ ایسے راہبین کے کہنے پر چلتے اور ساری دولت فقراء و مساکین میں تقسیم کرتے رہتے، تو خدا کا نام لینے والے تو بہت پیدا ہو جاتے لیکن خدا کے نام پر کام کرنے والے کہیں نظر نہ آتے۔

بہرحال حضرت عثمان کی سیاسی حکمت عملی کی بنیاد صرف اس جذبہ پر قائم تھی کہ مملکت اسلامی کے حدود کو وسیع کیا جائے اور یہ یقیناً خالص دینی جذبہ تھا، گو اس کا رخ زہد و تقویٰ کی دنیا سے علیحدہ تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کا مقصد فتوحات ممالک نہیں تھا بلکہ وہ صرف خدا کی طاعت و بندگی، اور فقراء و مساکین کی سی راہبانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتا تھا تو یہ الزام حضرت ابوبکر پر بھی عاید ہوتا ہے اور ان سے زیادہ حضرت عمرؓ پر کہ فتوحات اسلامی کے بانی و مؤسس وہی تھے۔ یہ امر بالکل خلاف فطرت ہے کہ کوئی قوم ابھرے اور اس میں آگے بڑھنے کا کوئی ولولہ پیدا نہ ہو اس لئے یہ فتوحات بالکل قدرتی نتیجہ تھیں اس جوش عمل کا جو اسلام نے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا اور اگر حضرت عمر کے بعد بجائے حضرت عثمان کے جناب علی خلیفہ منتخب ہوتے تو ان کو بھی وہی راہ اختیار کرنا پڑتی جو حضرت عثمان نے اختیار کی اور اگر وہ اس سلسلہ میں صرف بنو ہاشم ہی سے کام لیتے اور بنو امیہ کو نظر انداز کر دیتے تو بھی آخر میں یہی شورش پیدا ہوتی اور وہ بھی حضرت

عثمان ہی کی طرح قتل کر دیئے جاتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں حضرت عثمان کے متعلق یہ کہنا کہ افراد بنی امیہ کو آگے بڑھانے سے مقصود ان کا ان پر اعزہ و اقربا کی مدد کرنا تھا درست نہیں بلکہ ان کا مقصود اسلامی مملکت کو وسعت دینا تھا اور اس کی تکمیل ان کی رائے میں اسی وقت ہو سکتی تھی جب اس خدمت پر بنو امیہ کو مامور کیا جائے، کیونکہ دوسرے صحابہ یا افراد بنی ہاشم زیادہ تر زہد و اتقائی منوکلانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے اور انھیں فتوحات سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جب مدینہ۔ کوفہ و مصر وغیرہ میں تحریک مخالفت شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے وسعت اختیار کرلی تو اس کا سدباب کیوں نہیں کیا گیا لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوتا جب نظام حکومت کا سانچہ بالکل بدل دیا جاتا اور امرا بنی امیہ اور خصوصیت کے ساتھ امیر معاویہ کو معزول کر دیا جاتا جو قطعاً ناقابل عمل بات تھی۔ کیونکہ اس طرح ایک فتنہ فرو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑے دوسرے فتنہ کا مقابلہ کرنا پڑتا جو حضرت عثمان کے سن رسال کو دیکھتے ہوئے، ان کے لئے بالکل ناممکن تھا اس سلسلہ میں ایک سوال اور بھی سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت عثمان کے خلاف کوفہ، مصر، مدینہ وغیرہ میں اس شرانگیز شورش کا آغاز ہوا تو اس کو مٹانے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی اور حضرت عثمان کیوں خاموش بیٹھے رہے۔ اگر وہ سمجھتے تھے کہ یہ سازشیں باغیانہ و سرکشانہ ہیں تو ان کا فرض تھا کہ وہ قوت سے کام لے کر اس کو ختم کر دیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔

اگر طبری اور طبقات ابن سعد کے بیانات کو سامنے رکھا جائے تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی۔ مغیرہ بن شعبہ۔ زید بن ثابت، ابوہریرہ، ابن زبیر وغیرہ تمام اکابر مدینہ حضرت عثمان کے طرفدار تھے اور انھوں نے باغیوں کے خلاف قدم اٹھانے کی اجازت بھی چاہی، لیکن حضرت عثمان نے اس کی اجازت نہیں دی اور کہا کہ میں مفسدوں سے جنگ کر کے مسلمانوں میں خونریزی کرانے والا خلیفہ نہیں بننا چاہتا۔

پھر اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طرف تو ان کی بیرونی سیاست کا یہ عالم تھا کہ ملک پر ملک فتح ہوئے جاتے تھے اور دوسری طرف اندرونی سیاست میں انھوں نے اسقدر کمزوری دکھائی کہ باوصف اکابر صحابہ کی اعانت و ہمدردی کے گھر کے دشمنوں کے خلاف کبھی قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ علاوہ اس کے ہم نے مانا کہ حضرت عثمان مدینہ کے اندر خونریزی پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن ان کے معاون صحابہ کو کس نے روکا تھا اور کیا وہ یہ نہ کرسکتے تھے کہ مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی باغیوں کا قلع قمع کر دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نوع کی روایات زیادہ وزن نہیں رکھتیں اور حقیقت یہی ہے کہ خود مدینہ کے صحابہ بھی حضرت عثمان سے کچھ خوش نہ تھے اور انھوں نے قصداً اس شورش کو دبانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔


## ھندی شاعری نمبر

اس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔

قیمت :۔ ۴ روپے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

# رزمیہ بحر اور سحر البیان

## ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اُردو کی طویل مثنویوں میں جو شہرت و قبول عام "سحر البیان" یعنی "شہزادۂ بے نظیر و بدر منیر" کی داستان کو حاصل ہوا وہ کسی دوسری مثنوی کو میسر نہ آیا۔ یہ مثنوی بحر متقارب مثمن مقصور و محذوف یعنی فعولن فعولن فعولن فعول یا فعل کے وزن میں کہی گئی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بحر رزمیہ مثنویوں کے لئے مخصوص تھی اور میر حسن نے اسے بزمیہ مثنوی کے لئے استعمال کر کے روش عام سے انحراف یا ایجاد سے کام لیا ہے۔ چنانچہ دریائے لطافت میں انشا اللہ خاں لکھتے ہیں کہ :-

"ایں بحر مخصوص است بذکر محاربات سلاطین با سلاطین لیکن میر حسن مرحوم ریختہ گو قصۂ بے نظیر و بدر منیر در ہمیں وزن موزوں کردہ است"

انشا کے اس قول کو بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے نقل کیا ہے اور مولانا عبدالسلام ندوی و رام بابو سکسینہ سے لے کر جلال الدین جعفری و محمود فاروقی تک سبھی نے بحر کے انتخاب کے سلسلے میں اسے میر حسن کی جدت قرار دیا ہے۔ اگرچہ یہ بات حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ انشا اور ان کے موئدین نے اس سلسلے میں تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا۔ اس لئے کہ سحرالبیان کے وجود میں آنے سے بہت پہلے اردو میں متعدد عشقیہ مثنویاں بحر متقارب مثمن میں لکھی جا چکی تھیں اور خاص و عام میں مقبول ہو چکی تھیں۔ ممکن ہے میر حسن کو اس وقت ان کی خبر نہ رہی ہو اور ان سے استفادہ کا موقع نہ ملا ہو۔ لیکن سراج اورنگ آبادی کی مشہور و معروف مثنوی 'بوستانِ خیال' سے وہ ضرور واقف رہے ہوں گے۔ اس لئے کہ شمالی ہند کے تقریباً سارے قدیم تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ خود میر حسن کا تذکرہ سراج کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ :-

"سراج تخلص از مردم اورنگ آباد در وقت عالمگیر اوّل بود۔ از شاگردانِ سید حمزہ علی دکھنی روشن طبع معلوم می شود، خدا لیش بیامرزد"

اس کے بعد سراج کے کلام کا انتخاب ہے۔ ہر چند کہ اس میں سراج کی مثنوی بوستان خیال کا ذکر نہیں ہے۔ پھر بھی قیاس یہ کہتا ہے کہ "بوستان خیال" زبان و بیان کی غیر معمولی پاکیزگی کے سبب میر حسن اور ان کے دور کے شعرا کی نظر سے مخفی نہ رہی ہو گی۔

'بوستان خیال' ولی کی وفات (۱۱۱۹ھ) کے پورے چالیس سال بعد ۱۱۶۰ھ میں لکھی گئی ہے اور سن تصنیف کی مناسبت سے اس میں گیارہ سو ساٹھ اشعار ہیں۔ جب ولی کا کلام ۱۱۱۹ھ سے پہلے شمالی ہند پہنچ کر قبول عام حاصل کر چکا تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ۱۱۱۹ھ اور ۱۱۶۰ھ کے درمیانی عرصے تک شمالی ہند کے لوگ سراج جیسے صاحب کمال شاعر سے بے خبر رہے ہوں۔ تاریخی حالات و قرائن اور اردو شعرا کے تذکروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ میر حسن اور ان کے معاصرین، سراج اور ان کی مثنوی بوستانِ خیال سے بہر طور

واقف تھے۔ بلکہ بوستان خیال اور سحر البیان کو ایک ساتھ سامنے رکھیں تو یہ گمان ہوتا ہے جیسے میر حسن نے اپنی مثنوی کا طرز در اصل بوستان خیال سے اُڑایا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ دونوں بحر دونوں میں ایک سی ہیں بلکہ انداز بیان کے لحاظ سے بھی ان میں اکثر جگہ بڑی مماثلت ہے۔ سراج نے اپنی مثنوی میں باغ کی تصویر اس طور پر اُتاری ہے۔

ہر اک سمت پانی کی نہروں کی سیر        وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
رواں آب کے ہر طرف آبشار        جدھر دیکھیے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا        تماشا تھا ہر مور کے شور کا
ہر اک سرو پر عشق پیچے کی بیل        خوشی کے گلے کی تھی گویا حمیل
ہر ایک حوض پانی سے لبریز تھا        ہر اک قطعۂ باغ گل خیز تھا
سمن، ارغواں، نرگس و عبہری        گل و لالہ و سیوتی جعفری
ادھر بلبلوں کی غزل خوانیاں        ادھر پھول کی شبنم افشانیاں
نپٹ جھوم آیا تھا ابرِ بہار        برستی تھی باریک جھم جھم پھوار
جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں        خمِ زلف لیلیٰ کے افسوں کی تھیں
عجب وقت تھا اور عجب رنگ تھا        ولیکن مرا دل نپٹ تنگ تھا
مجھے دیکھنا تلخ تھا اس طرف        کہ تھا دل مرا تیرِ غم کا ہدف
ادھر سرو و رعنائے سبزے کی دھوم        اُدھر نغمۂ قمریوں کا ہجوم

اب میر حسن کے باغ و بہار کا نقشہ دیکھیے :-

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ        ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان        لگے جیسے زربفت کے سائباں
چقیں اور پردے بندھے زرنگار        دروں پر کھڑی دستِ بستہ بہار
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر        کہ مہ کا بندھے جس سے تارِ نظر
وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس        بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
چمن سے بھرا باغ گل سے چمن        کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا        کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا        اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
پڑی آب جو ہر طرف کو بہے        کریں قمریاں سرو پر چہچہے
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر        نشہ کا سا عالم گلستان پر
خراماں صبا صحن میں چار سو        دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور        درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے        لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا | ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیر یاں کرکے پھول | پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

سراج اور میر حسن کی لفظی تصویروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ سراج سے قطع نظر خود شمالی ہند میں بعض ایسے باکمال شاعر گزرے ہیں جو سحرالبیان کی بحر میں عشقیہ مثنوی کہہ چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکیں اور آج کوئی ایسی مکمل مثنوی موجود نہیں ہے جس سے سحرالبیان کا مقابلہ کیا جاسکے لیکن نامکمل عشقیہ مثنویوں کے جو اجزاء قدیم تذکروں میں ملتے ہیں ان کے دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کے سامنے عشقیہ مثنویوں میں رزمیہ بحر کے استعمال کے نمونے موجود تھے۔

اس قسم کی عشقیہ مثنویوں میں فضائل علی خاں بے قید کی مثنوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ مثنوی بھی ایسی پاکیزہ ہو کہ مثنوی نگاروں کے لئے ضرور کسی نہ کسی طور پر مشعل راہ بنی ہوگی۔ بے قید کی مثنوی میں پانچسو اشعار تھے اور وہ اپنے زمانے میں حد درجہ مشہور و مقبول تھی۔ خود میر حسن اپنے تذکرے میں فضائل علی خاں بے قید کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں :۔

"از موزونانِ جہاں فضائل علی خاں بے قید تخلص۔ جوانِ محمد شاہی بود۔ خوش خوراک و خوش پوش، بکمال خوبی لبسر می برد۔ درشعبدہ بازی و صحبت داری کامل بود۔ طبع تیز و درد مند داشت۔ مثنوی اولبیا مشہور است۔ حسبِ حال خود مثنوی گفتہ و درہائے معنی سفتہ"

میر حسن نے اپنے تذکرے میں بطور مثال اس مثنوی کے کچھ اشعار بھی نقل کر دئے ہیں اور ان سے بے قید کی مثنوی کی شانِ نزول سمجھ میں آتی ہے۔ بے قید دراصل ایک بت ہندی پر عاشق تھے۔ چنانچہ گردشِ زمانہ سے مجبور ہوکر جب انھیں نواب عمدۃ الملک کے ساتھ الہ آباد جانا پڑا تو محبوب کی جدائی میں مضطرب و بے قرار رہنے لگے اور جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔ نواب صاحب موصوف نے جب یہ حال دیکھا تو ایک دن بے قید کی دلبری و دلجوئی کے لئے اربابِ عیش و نشاط کو جمع کیا اور ایک طوائف کو اشارہ کیا کہ دلربایانہ ناز و ادا سے ان کو اپنے دام میں لے آئے شاید کہ اس طور پر ان کے دل کو سکون ہو اور غم و اندوہ سے نجات مل جائے۔ آخر کار مجمع سے ایک نازنیں اٹھی اور ہزار عشوہ و غمزہ سے انھیں رام کر لیا۔ بے قید نے اسی عالم میں یہ مثنوی اپنے حسبِ حال کہہ کر کمالِ فن کا اظہار کیا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہوئی کہ جب مقصود دل حاصل ہوگیا تو وہ اس پری رو کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ پہلی محبوبہ ان کے سامنے ہے اور شکوہ و شکایت کر رہی ہے چنانچہ بے قید اس خواب کی کیفیت خود اس طور پر بیان کرتے ہیں ؎

عجب خواب دیکھا میں اس خواب میں | ہوا جس سے میں پیچ اور تاب میں
ہوا تھا جنھوں سے میں اوّل جُدا | سو کیا دیکھتا ہوں وہی دل ربا
کہ جو چاہتی تھی مجھے دل ستی | جدا کبھی ہوا تھا وہ مشکل ستی
سو کہتی ہے یوں۔ میرا دامن پکڑ | کہ چھوٹے ترے غم سے میرا جگر
شب و روز رونا میرا کام ہے | ترا نام لینے سے آرام ہے
پھرے میرے یوسف تو کس کس گلی | تری چاہ میں میں ہوئی باولی
یہاں تو جو چاہے کرے مرے ساتھ | قیامت کو دامن ترا مرے ہاتھ

اس کے بعد جوں ہی خواب سے آنکھ کھلی ۔ کسی شخص نے کہا کہ آپ کی تلاش میں کوئی آیا ہے ۔ باہر نکلے دیکھا کہ قاصد ایک خط لیے کھڑا ہے ۔ خط کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ اسی محبوبہ کا خط ہے ۔ اس خط میں کیا لکھا تھا ۔ یہ خود بے قید کی زبان سے سنیئے ۔

جو دیکھا لفافے پہ لکھا ہے یہ　　　　کہ کھول شتابی برہ کی گرہ
تمہاری خوشی سے یہاں خیر ہے　　　　سدا ہجر کے باغ کی سیر ہے
بہت پھول لالہ دکھائے مجھے　　　　ترے داغ سے کچھ نہ بھائے مجھے
نہ بوجھی بد تم اب تلک میری سار　　　　جو جیتی ہوں میں اپنی قسمت سے ہار
کہوں کون ہے وہ جواہر مثال　　　　بسے کس کے ہیرے میں اے میرے لال
جو دیکھے اتنا تم رنگ سرخ و سفید　　　　مرے تاج سراب نہ رکھیو امید
کروں کیا نکلتی نہیں جان ہے　　　　کہ یہ میری غلطی کا تاوان ہے
زیادہ نہیں اس سے کچھ مدعا　　　　یہی مدعا تھا لکھا والدعا

افسوس کہ بے قید کی پوری مثنوی ہمارے سامنے نہیں ۔ صرف کچھ اشعار مختلف تذکروں میں محفوظ ہیں ، لیکن اس مختصر نمونے سے یہ پتہ تو بہر حال چل جاتا ہے کہ لوگوں کو چراغ سے چراغ چلانے میں مدد ملی ہوگی ۔

ایک اور مثنوی اسی انداز کی ہے اور وہ بھی سحر البیان ہی کی بحر میں کہی گئی ہے ۔ میر حسن کے تذکرۃ الشعرا میں اس کا ذکر ہے اور بہت ممکن ہے سحر البیان کو نظم کرتے وقت میر حسن نے اس مثنوی سے بھی تاثر قبول کیا ہو ۔ ان کا بیان ہے کہ :۔

"افضل الدین خاں فضلی تخلص در زمان خود از خوش گویاں بود ۔ یک مثنوی در تعریف شہزادہ قریب پانصد بیت بہ آب و تاب گفتہ ۔ خدایش بیامرزد ۔ ایں از اں مثنوی است ؎

عرق رخ پہ جوں آرسی میں حباب　　　　تبسم لباں پر جوں موج شراب
زنخ جوں مربہ دسے سیو کا　　　　پہ واں ہاتھ کب پڑ سکے دیو کا"

ان صراحتوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ انشا اللہ خاں کا یہ کہنا کہ میر حسن نے عشقیہ قصے کے لئے رزمیہ بحر کا استعمال کر کے جدت کی ہے درست نہیں ہے ۔ دکن اور شمالی ہند دونوں جگہ عشقیہ مثنویوں میں بحر متقارب مثمن محذوف و مقصور کا استعمال میر حسن سے پہلے بھی ہوتا تھا بلکہ اردو میں اس نوع کی کئی اچھی مثنویاں سحر البیان کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھیں اور کیا عجب کہ میر حسن نے پچھلے شعرا کے تجربوں کو کامیاب دیکھ کر سحر البیان کے لئے اس بحر کو تقلیداً استعمال کیا ہو ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا رنگ سارے مثنوی نگاروں سے الگ ہو گیا اور ان پر کسی کی تقلید یا تتبع کا الزام نہیں آتا ۔


## عرض نغمہ

ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے معہ ایک بسیط مقدمہ کے ۔　　قیمت ایک روپیہ

نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

# شعر حسن صداقت اور انسانیت کا ترجمان ہے

خواجہ غلام السیدین

"کیا بات ہے کہ بہت سے کھاتے پیتے، ہنستے، کھیلتے کام کرتے، چیزیں بناتے، دولت کماتے، انسان کبھی کبھی ان معقول چیزوں کو بھول کر یا بھلا کر ادب، شاعری، مصوری اور موسیقی اور اسی قسم کے دوسرے تخلیقی کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور بعض تو ان دانش مندانہ مشاغل کو چھوڑ کر ایسا کرتے ہیں۔ سب نہیں لیکن بہت سے ایسے سر پھرے بھی ہیں جو اس تخلیقی کاروبار میں اپنے خلاق دماغ اور بے چین روح کے لیے تسکین پاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جیسا مسیح علیہ السلام نے اب سے دو ہزار برس پیشتر کہا تھا، انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا۔" عقل دنیا دار کے بچاری کچھ بھی کہیں، ایک بھرپور زندگی کا حسین پیکر تیار کرنے کے لیے ضرورت ہے بہت سے رنگوں اور تاروں کی، بہت سے سروں اور دل کی دھڑکنوں کی، بہت سے خوابوں اور آرزوؤں کی، بہت سے المیوں اور بزمیوں کی۔

## انسان کی ایک خصوصیت

یہ سب دولت نادیدہ محض مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش میں ہاتھ نہیں آتی۔ انسان میں کوئی ایسی چیز ہے جو اس کو محض نفس پرستی یا دولت آفرینی پر قانع نہیں ہونے دیتی مگر یہ کہ وہ ان کے دھندوں میں اس بری طرح اور اتنی مدت کے لیے پھنس جائے کہ اس کے دل کے تاروں کی لرزش بند ہو جائے اور اس کا احساس جمال اور ترانۂ قلب ان کے بوجھ میں دب کر اپنی لچک کھو بیٹھے۔ اس صداقت سے اس بہانے انکار نہ کیجئے کہ یہ ناگزیر ہے۔ انسانی زندگی کی مادی بنیادوں اور اس کی تلخ حقیقتوں سے، کون کافر اس زمانے میں ان بنیادوں سے انکار کرے گا۔ اور باوجود ارباب غرض اور مفاد مخصوص کی کوششوں اور ریشہ دوانیوں کے اپنے مادی سیاسی یا سماجی حقوق ہاتھ سے دینے کو تیار ہو جائے گا۔؟

میرا ایمان ہے کہ ہمیں ایک انصاف پسند سماجی نظام بنانا چاہیئے۔ جس میں ہر کسی کی بنیادی ضرورتوں کو معقولیت کے ساتھ پورا کیا جائے لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ یہی انسان کی منزل مقصود بھی ہے، اس کا بلند ترین نصب العین بھی ہے یعنی مادی ضرورتیں بڑھاتے جاؤ۔ ان کی تسکین کرتے رہو خواہ اس کی کوئی قیمت بھی ادا کرنی پڑے اور تہذیب ترقی کرتی رہے گی۔ زندگی سہل ہوتی جائے گی۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ سائنس صنعت و حرفت اور تسخیر فطرت کے اس چکا چوند دور میں اس پہلو کی اہمیت پر (اور یقیناً بنیادی طور پر اہم ہے یہ پہلو) اس قدر زور دیا جا رہا ہے کہ دوسرے اہم پہلوؤں کے نظر انداز ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہت سے لوگ سوچتے ہیں، کہتے ہیں، اعتراض کرتے ہیں ایٹم کے سامنے فکر کا چراغ کیا کام

دے گا۔ شعر کی شمع کس طرح جلے گی۔ مصوری کون سے گل کھلائے گی۔ ادب کون سی گتھیاں سلجھائے گا۔

## مقصد اور ذریعے کا فرق

ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جو لوگ اس انداز فکر میں مبتلا ہیں خواہ وہ مغرب کے تجربہ کار ہیں یا مشرق کے جہاں دیدہ، وہ زندگی کو دیکھتے ہیں آنکھوں پر اندھیریاں چڑھا کر اور مقصد اور ذریعہ میں امتیاز نہیں کر پاتے۔

زندگی کی جڑیں بھی ایک پیڑ کی جڑوں کی طرح زمین میں پیوست ہونی چاہئیں لیکن پیڑ کی طرح زندگی بھی اسی وقت شگفتہ اور شاداب ہوتی ہے۔ جب اس میں پتیاں نکلتی ہیں، پھول کھلتے ہیں، پھل پختگی کو پہونچتے ہیں۔ اور زندگی کے پھل اور پھول ہیں علم اور عدل، محبت اور حسن خیر اور انسان دوستی فن اور فن کاری جن کو بٹورنے کے لیے فرصت ہے۔ ان تمام حساس انگلیوں کی جن کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے، یعنی فکر و فہم شعر و ادب، موسیقی اور مصوری سائنس اور فلسفہ۔

اگر ہماری شاعری اور مشاعرے اس آدرش کی تھوڑی سی سیوا بھی کر سکیں تو ان کے لیے دیدہ حسن فرش راہ ہیں ورنہ محض تضیع اوقات ہیں یا زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی۔

کہتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن نہ کہوں تو خود کے ساتھ نباہ مشکل ہو جائے گا کہ اس زمانے میں جس طرح زندگی کے اور بہت سے شعبوں اور دھندوں میں کیفیت کے بجائے کمیت کی طرف رجحان ہے۔ جس طرح ان میں دودھ کے ساتھ پانی کی محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح کل کے بیشتر مشاعروں میں بھی دوکانیں صاف اور پاک جنس سے خالی ہوتی جاتی ہیں اور ان میں گھٹیا درجے کا مال زیادہ بکنے لگا ہے۔

## شعر اور مشاعرہ

جانتا ہوں کہ ایک لحاظ سے مشاعروں نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور آزمائش کے اس دور میں ملک کو اس خوب صورت اور نیک سیرت زبان سے گوش آشنا رکھا ہے۔ ایک مشاعرے کا اعلان کر دیجئے اور ہال کو بھر دیجئے۔ اسی طرح فلموں نے بھی اردو یا ہندوستانی زبان کو مقبول بنایا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو حاضرین وقت کے سوا دوسرے شعراء سے پوچھوں کہ کیا ہر رطب ویابس شعر کو ایک نیم فلمی انداز میں پیش کر دینا شعر خوانی یا شاعری کی خدمت ہے۔ کیا پرانے جگر گوشوں کو جن پر وقت کی خاک جم گئی ہے، بار بار سال بہ سال پیش کرنا خوش ذوق سامعین کے ساتھ اور خود اپنے ساتھ انصاف ہے؟ کیا بجائے صاحبان ذوق اور اہل نظر کے خالی الذہن شوقینوں کو مخاطب کرنا اور ان کے ناسلیم ذوق کو گدگدانا شاعری کے وقار کا احترام ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور میرا ایمان ہے کہ نہیں ہے، تو مشاعروں میں آداب شعر و سخن کو واپس بلایئے۔ تحسین سخن شناس (بلکہ سکوت سخن شناس) کو بھی تحسین ناشناس پر ترجیح دیجئے۔ نرخ کو بالا کیجئے۔ اپنے مال کو اپنے داموں پیش کیجئے۔ چور بازار کی قیمت پر فروخت نہ کیجئے۔ پھر وہ آب و ہوا پیدا کیجئے جس میں خون جگر کی گود میں پلے معجزہ ہائے سخن پیش کئے جا سکیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں کھرا مال وہی ہے جو پرانے سونے کی طرح کسوٹی پر پورا اترے۔ شعر کی ایک آنکھ سے حسن کو دیکھیے اور دوسرے سے صداقت انسانیت کو اور پھر بصیرت میں ان دونوں کو ڈھال کر ایک کر دیجئے۔ پھر شعر شعر بن کر چمکے گا محض لفظوں کا کھیل نہ ہوگا۔ جو تفریح کا سستا مشغلہ بن کر رہ جائے۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ شاعری کو خواص کے لیے مخصوص کر دیں اور عوام کی زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دیں ہرگز نہیں۔ خود کو نام نہاد خواص کے ذوق کے ساتھ وابستہ کر لینا تو زوال آمادگی کا ثبوت ہے اور خواص کے ساتھ ذہنی

وابستگی شاعر کو ایک شیش محل میں بٹھا دیتی ہے۔

## زندگی کی قدریں

دراصل ادب اور شاعری میں قوت اور خلوص پیدا ہوتا ہے جب وہ زندگی کی صالح قدروں کے ساتھ وابستہ ہوں اور یہ قدریں زیادہ تر پائی جاتی ہیں کھلی یا چھپی، عام لوگوں کی زندگی اور ان کی سیوا میں آج کے روز اس جشن کے موقع پر اس بات کو یاد دلانا خاص طور پر ضروری ہے کیوں کہ یہاں شعرا کو اپنی زبان بنا کر ہمیں بعض چیزوں کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کا اعلان کرنا ہے اور بعض چیزوں سے برأت اور بیزاری کا۔

شاید یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہو کیوں کہ بزم مشاعرہ میں شاعر یا سامعین کسی پالیسی کا اعلان نہیں کرتے۔ لیکن دراصل یہ اچنبھے کی بات ہے نہیں۔ آج ہم اپنی آزادی اور جمہوریت کا جشن منا رہے ہیں۔ اپنی وطن دوستی کے عہد کو دہرا رہے ہیں۔ ٹیگور اور گاندھی، آزاد اور نہرو سروجنی نائیڈو اور بہت سے دوسرے ہم نفسان رفتہ کے ساتھ پیمانِ محبت اور وفا کی تجدید کر رہے ہیں۔ آخر اس سب تماشے کا مقصد کیا ہے یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ہمارے سیاسی سماجی اور اخلاق نیتاؤں کے دوش بدوش ہمارے شاعر اور ادیب مفکر اور معلم بھی اس یاترا میں حیات برتر کی اس تلاش میں شریک ہیں جو صدیوں سے دنیا کے ہر گوشے میں ہوتی آئی ہے جو قدریں ان قائدین فکر و عمل نے پرکھ کر اپنائی تھیں۔ ہمیں ان کا پرچار کرنا ہے۔ اور جو قدریں ہم خود اپنے ذہن کی روشنی میں پہچانیں گے۔ انھیں بھی اپنے لیے شمع راہ بنانا ہے۔

ایک خلاق فن کار کی شاعری لفظوں میں جادو پھونک سکتی ہے اور معنی کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑا سکتی ہے۔ لیکن جو شاعری محض لفظوں کا کھیل کھیلے اور اس میں بھی حسن نہ ہو، جو محض سطحی جذبات کا اظہار کرے، جو خلوص سے خالی ہو، جو نہ کسی نئی دنیا کا خواب دیکھے نہ اس کو عمل میں لانے کی تڑپ رکھتی ہو، جو یا رسم پرستی کی غلام ہو، یا فیشن پرستی میں اسیر، اس سے نہ تسکین حاصل ہو سکتی ہے نہ شانتی۔ پھر اسے دعوائے خام کس چیز کا ہے؟

## بے اندازہ دولت

زندگی کا میدان بہت وسیع ہے اور اس میں ہر طرح کی بے اندازہ دولت بکھری ہوئی ہے اس کے دامن کو تنگ نہ کیجیے۔ اس میں گل و بلبل اور افسانۂ فراق وصال بھی ہے۔ مشینیں اور مزدور بھی ہیں۔ تلخ اور ناگوار حقیقتیں بھی ہیں ظلم اور جہالت اور بیماری اور افلاس اور فاقہ کشی۔ سربلند انسان کی وہ فتح مندیاں بھی ہیں جو اس نے ان کے خلاف فطرت کی بے پناہ قوتوں کے خلاف اور خود اپنی فطرت کے فرومایہ تقاضوں کے خلاف حاصل کی ہیں یہ تمام دولت یہ تمام تجربے یہ شیرینیاں اور تلخیاں ایک سچے شاعر کے لیے جو اپنا کیسہ بھرنا چاہتا ہے چشم انتظار و اشتیاق کھولے ہیں یعنی "متاع جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا"۔ ہاتھ بڑھا کر اس کو اٹھا لیجیے۔ اور اس کے لطف و معنویت کو ایک خوبصورت و دلنشین سانچے میں ڈھال کر پیش کیجیے جس سے حسب موقع کام و دہن مسرور ہوں یا دل پر چوٹ پڑے یا عزم بلند سر اٹھائیں۔

کئی سال ہوئے ایک مغربی مصنف نے حضرت عیسیٰ کے اس قول کی بڑے خوب صورت انداز میں تفسیر لکھی تھی کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا جس کا ترجمہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

"انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا بلکہ زندہ رہتا ہے حسن اور ہم آہنگی سے، سچائی اور نیکی سے کام اور کھیل سے محبت اور دوستی سے آرزو کی خلش اور عبادت کے شوق سے"۔

صرف روٹی سے نہیں بلکہ رات کے سناٹے میں تاروں بھرے آسمان کی خوب صورتی سے طلوع آفتاب کے وقت آسمان کی شان و شوکت اور غروب آفتاب کے وقت رنگوں کے حسین میل سے پھولوں سے بھرے ہوئے درختوں کی جمال اور سربفلک

پہاڑوں کی عظمت اور جلال سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ سمندر کی موجوں کے جوش و خروش سے، جھیل کے ساکن پانی پر چاند کی نقرئی کرنوں کے کھیل سے، پہاڑوں اور نالوں کے تڑپتے ہوئے سیمابی پانی سے، برف کے شفاف ٹکڑوں کی حسن کاری اور باکمال کلاکاروں کی صناعی سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں، بلکہ بلبل کے میٹھے راگوں سے، درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ سے، ستار کے جگاتے ہوئے جادو سے، اور عبادت خانوں کی دھیمی روشنی کی اثر آفرینی سے"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ گلاب کی عطر بیزی سے، نارنگی کے شگوفوں کی مہک سے، تازہ کٹی ہوئی گھاس کی بھینی بھینی خوشبو سے، دوست کے مصافحے کی گرمی اور ماں کے محبت بھرے پیار کی نرمی سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ شاعروں کے تغزل سے، حکیموں کی حکمت سے، ولیوں کے تقدس سے، اور بڑے آدمیوں کی زندگی کی داستان سے۔"

"صرف روٹی سے نہیں بلکہ رفاقت اور حوصلہ مندی سے، ڈھونڈنے اور پانے سے، سیوا اور مل بانٹ کر کھانے سے، چاہنے اور چاہے جانے سے۔"

"انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا وہ رہتا ہے زندہ حضور قلب کے ساتھ عبادت کرنے سے، ہدایت الٰہی کے لیے دل کے دروازے کھول دینے سے اور رضائے الٰہی کے راستے پر چلنے سے۔"

باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی گزارنی ہے اور شاعری کرنی ہے تو اس طرح کا دل اور دماغ، اس طرح کا نکتہ نظر پیدا کیجیے جس میں ان تمام چیزوں اور ولولوں اور قدروں کے لیے گنجائش ہو۔


# اقبال نمبر

جس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا فلسفہ و پیام، تعلیم اخلاق و تصوف، اسکا آہنگ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت:۔ تین روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

# بابُ الانتقاد

## "خدا کی بستی"

اے۔ بی۔ اشرف

بستی خُدا کی بسائی ہوئی ہو یا انسانوں کی، بستی ہے تو اُجڑتی بھی ہے تعمیر ہوتی ہے تو تخریب کے صدمے بھی سہتی ہے۔ اس میں فردوس کے خنک جلوے بھی ہوتے ہیں اور جہنّم کے آتشیں شعلے بھی، ظلمت و نور کی کش مکش بھی ہوتی ہے اور آس نراش کے سودے بھی۔ اس میں انسان بھی بستے ہیں اور شیطان بھی، "خدا کی بستی" میں یہ سب کچھ ہے اور اس کو بسانے والا نہ تو خدا ہے اور نہ عام انسان بلکہ ایک فن کار ہے لیکن اس فنکار نے اس بستی کی تعمیر تخیّل سے زیادہ حقیقت کی بنیادوں پر کی ہے۔

شوکت صدیقی کا یہ ناول ہمارے ایک دَور کا آئینہ ہے —— ایک ایسے عبوری دَور کا جس میں ابھی معاشرتی، اقتصادی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا تعیّن نہیں کیا جا سکا۔ جس میں طبقاتی کش مکش اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس آئینہ میں ہم اس دَور کے نہ صرف خارجی خد و خال کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اسکے داخلی اور باطنی نقوش بھی نمایاں ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس دَور کا اعصابی نظام، سوچ کے انداز اور تعمیر و تخریب کی کشاکش، —— یہی اس ناول کی کُل کائنات ہے۔ "خُدا کی بستی" میں زندگی کے عظیم مسائل نہیں ہیں عام مسائل ہیں اور آج ہماری زندگی عام مسائل سے دوچار ہے عظیم مسائل سے نہیں۔

چند لڑکے بالے لونڈے لاڑیئے، جو ابھی عمر کے اس حصّے میں ہیں جہاں غم زیست ایک ڈراؤنے خواب کی طرح بھی قریب بھٹکنے نہیں پاتا، جہاں چند سکّے قارون کا خزانہ، دس آنے میں ایک فلم راجہ اندر کا اکھاڑہ اور خوش ذائقہ کھانا من و سلویٰ کا مزہ دیتا ہے، زندگی کی ناہمواریوں کی بدولت زہر کے تلخ گھونٹ گلے سے اتارتے، بال سے باریک اور تلوار سے تیز دھار حالات کے پُل صراط پر سے گزرتے، کوڑھیوں کی مزدوری کرتے، مستری عبداللہ شاہ جی اور استاد پیڈرو کی عجیب و غریب سزائیں جھیلتے، تنگدست والدین کے کوسنے سہتے چلّا اُٹھتے ہیں۔

"یار میرا جی چاہتا ہے کہ مر جاؤں —— سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے"۔

شوکت صدیقی نے معاشرے کے تلخ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے حُسن، خیر، روشنی اور اُجالے کی علمبرداری کرنے والے تو بہت ہیں لیکن ظلمت، تاریکی اور بدصورتی کو گلے لگانے والے چند لوگ ہوتے ہیں۔ چمکتی چھلکتی چیزوں کو پیش کر کے ناظر کی آنکھوں کو خیرہ کرنا کمال نہیں، فن کاری تو یہ ہے کہ گری پڑی چیزوں کو حسنِ لازوال بخش دیا جائے۔ "خدا کی بستی" کے خالق نے فردوس اور حور و خیام کے جلوے نہیں دِکھلائے جہنّم کے عبرت زا پہلوؤں کو پیش کیا ہے لیکن اس پیش کش میں مبالغہ نہیں ہے حقیقت اور صداقت نے اس میں بار پایا ہے۔ ہم اِن پہلوؤں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ہمارے ضمیر تک ان کی آواز پہنچی تو ہے لیکن اس آواز کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس شوکت اِن کریہہ المنظر پہلوؤں سے محبّت ہی نہیں کرتے اُن سے محبّت کرنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے ہاں معاشرے کی ناہمواریوں پر جھنجھلاہٹ اور شدّت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان

اور کتے میں گہری مناسبت نظر آنے لگتی ہے۔

"اب وہ لاوارث کتوں کی طرح دن بھر گلیوں میں آوارہ گردی کرتا پھرتا"

"گرم گرم کھانے کی خوشبو نتھنوں میں پہنچی تو وہ مریل کتے کی طرح سہما ہوا سا اُسکی طرف بڑھا"

لیکن اس جھنجلاہٹ کے پس پشت اُن کی محبت، اُن کے خلوص اور ہمدردی کی دھیمی دھیمی آنچ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جب سلیمان پروفیسر احمد علی سے کہتا ہے

"زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھیئے، وہ کس قدر مظلوم ہے"

تو گویا شوکت کی جھنجلاہٹ اپنا حق ادا کردیتی ہے۔ دراصل شوکت صدیقی اپنے موضوع کی پیش کردہ سطحی صورت سے گزر کر داخلی حقیقت تک جا پہنچے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کا یہ نظارہ ہی وہ چیز ہے جس پر اُن کے فن کی عظمت کا دارومدار ہے۔ انہوں نے اپنے موضوع کی زندگی اور اس کے مفہوم میں داخل ہو کر ہی اس حقیقت کا ادراک کیا ہے۔ اور ادراک کر کے دوسروں کو بھی بصیرت عطا کی ہے۔ ایک بہت بڑے شہر کی خیرہ کُن روشنی کے عقب میں جو تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں اور ان تاریکیوں میں معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی مخلوق، یتیم بچے، بیوائیں، لاوارث کنواریاں، سسک سسک کر زندگی کے سانس لے رہی ہیں ——— ناول نگار چشم بصیرت کے سیلابِ نور سے ان کو منور کرتا چلا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ عریاں، ٹھٹھرتے اور کپکپاتے ہوئے جسم، داغدار نظر آتے ہیں لیکن کچھ لوگ ان میں نور کی شعاعیں پھوٹتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ یہ فکر و نظر کی آزمائش دراصل اس آئینے کی بدولت ہے جس میں ہم نے ان عریاں جسموں کو دیکھا ہے۔

ناول نگار نے پورے ناول کو دس فصلوں میں کچھ اس طرح سمیٹا ہے کہ پلاٹ[1] فنکاری کا مکمل نمونہ بن گیا ہے حشو و زوائد کا اس میں نام نہیں۔ زندگی کسی واقعی منطقی ترتیب سے خالی ہے لیکن اس کو ایک ترتیب اور تنظیم کے ساتھ پیش کرنا ہی تو فنکار کا کام ہے۔ شوکت صدیقی نے اس فرض کو نبھایا ہے لیکن ضرورت سے زیادہ احتیاط نے پلاٹ میں فطری نو پذیری کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ پلاٹ "سراسر فنکاری" کا تو اچھا نمونہ ہے لیکن اس میں لچک اور "آمد" کا احساس نہیں ہوگا۔ پہلی فصل شروع ہوتی ہے تو ہمیں چند کرداروں (راجہ، نوشا، شامی، سلطانہ، نیاز اور سلیمان) سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ چند ہی لمحوں میں ہم ان سے اس حد تک مانوس ہو چکے ہوتے ہیں کہ ہم اُن کے گزرانِ حیات میں ایک گونہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ دوسری فصل میں بھی یہی کردار ہماری توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کے کئی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ راجہ اور نوشا کی آوارگی، سلیمان کے گھریلو اور تعلیمی مسائل، نیاز کی چور بازاری اور سیاہ دھندا، نوشا کی بیوہ ماں اور کنواری بہن سلطانہ کی بے چارگی ——— !

---

[1] جناب سید عابد علی عابد سے اس موضوع پر گفتگو کا اتفاق ہوا تو اُنہوں نے اِس خیال کا اظہار فرمایا کہ ناول کا پلاٹ کمزور ہے۔ میری ناقص رائے اس کے برعکس ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر تو "امراؤ جان ادا" کے پلاٹ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

فصل سوم میں راجہ اور نوشا گھر سے نکل بھاگتے ہیں۔ کراچی پہنچکر شاہ جی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ــــــ شاہ جی، جو چوروں اور نوسر بازوں کا سرخیل ہے۔ راجہ کا کوئی نہیں جو اس کے لئے آنسو بہائے مگر نوشا کی ماں کا سہارا چھن گیا ہے۔ آخر اُسے ایک اور سہارا مل جاتا ہے اور نیاز اس ڈھلتی ہوئی دھوپ کو اس لئے گلے لگا لیتا ہے کہ اس کے ڈھل جانے پر اُسکی جوان سال بیٹی سلطانہ کا خنک اور لطیف سایہ اُسے نصیب ہونے والا تھا۔

فصل چہارم ہمیں کراچی لے جاتی ہے جہاں راجہ کی نشان دہی پر شاہ جی اور اس کے ساتھی انجینئر کی کوٹھی پر چوری کرتے ہیں، لیکن راجہ ہی کی مخبری پر سارا گروہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ راجہ اور نوشا بھی ایک ایک سال قید کی سزا پاتے ہیں۔ پانچویں فصل میں "سکائی لارکوں" کی اصلاحی انجمن وجود میں آتی ہے۔ اس انجمن کے رُوحِ رواں، صفدر، بشیر، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر زیدی اور سلیمان ہیں۔ "فلک پیما" ایک عملی تنظیم ہے لیکن اگلی فصل میں نواب فرزند علی خاں اس تنظیم کو تباہ کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ مذہب کی آڑ لیکر اصلاحی اور رفاہی اداروں کی راہ میں رکاوٹ بننے والے کن کن فریب کاریوں اور حیلوں سے کام لیتے ہیں۔ لوگوں کو اس کا احساس تو ہے۔

"یہ چودھویں صدی ہے ہمارے حضورؐ نے کہا تھا کہ چودھویں صدی میں کچھ بھی ہو جائے کم ہے، اب تو اللہ کے نام پر لوٹ ہونے لگی ہے۔ یہ لوٹ نہیں تو کیا ہے۔ بغیر پوچھے گچھے چوروں کی طرح مسجد بنا ڈالی۔ سالوں نے خدا کے گھر کو بھی مذاق بنا ڈالا"

لیکن وہ محسوسات کی منزل سے اُوپر نہیں اُٹھتے۔ جہالت کی وجہ سے لوگوں کے دل و دماغ شعور و آگہی کی دولت سے محروم ہیں۔ اور ذرا ہی دیر میں وہ ایک کرایے کے مولوی کی باتوں میں آکر سکائی لارکوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور خان بہادر فرزند علی خان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ سلیمان کے دل میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

"سارے گندگی کے کیڑے ہیں۔ گندگی ہی میں خوش رہتے ہیں۔ ان کی بھلائی کے لئے کچھ کرنا خوامخواہ کی دردسری ہے۔"

اس کے باوجود سکائی لارکوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ کمیٹی کے الیکشن میں اسکائی لارک بھی حصّہ لینا چاہتے ہیں اور صرف اس لئے کہ "اگر انتخابات میں شرکت نہ کی جائے گی تو خان بہادر یا اسی قبیل کے لوگ میونسپل بورڈ کے ممبر بنیں گے، جو خدمت خلق کی آڑ میں ہر ناجائز طریقہ پر عمل کریں گے" لیکن اُن کی ٹکر ایک با اثر سرمایہ دار سے ہے۔ خان بہادر کے خریدے ہوئے غنڈے سکائی لارکوں پر حملہ کرتے ہیں۔ انجمن کی عمارت جلا دی جاتی ہے۔ سکائی لارک زخمی حالت میں پڑے سسک رہے ہیں۔ غنڈے اُن کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے واپس جا رہے ہیں اور اس بستی کے لوگ جن کے لئے سکائی لارک فرشتے تھے، شیطانوں کی طرح کھڑے چھتوں پر سے جھانک رہے تھے ادھ جن کے دل کچھ کرنے کی امنگ سے معمور ہوتے ہیں، سازشوں کا شکار ہو کر یا تو موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں اور یا پھر

زندگی کے دھارے کو بدل کر دریا کی روانی کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ ان میں مخالف لہروں سے لڑنے کی سکت نہیں ہوتی اور آخر کار راہی بے منزل کی طرح زندگی کے بیہم رواں سیل میں بہہ جاتے ہیں۔

نئی فصل شروع ہوتی ہے تو راجہ اور نوشا جیل سے رہا ہوتے ہیں لیکن نہیں ——— نوشا کے ساتھ راجہ کی بجائے پوکر ہے۔ راجہ ہسپتال میں داخل ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اُسے کوڑھی کی خدمت کا صلہ مل گیا ہے۔ وُہ اپنے گناہوں کا کفارہ ہسپتال میں پڑا ادا کرتا ہے۔ نوشا استاد بیڈرو کے گروہ میں شامل ہو کر جیب کترنے کا دھندا شروع کرتا ہے۔ نیاز سلطانہ کی ماں کو زہریلے انجکشن لگوا کر موت کی نیند سُلا چُکا ہے اور بیمے کی رقم سے کوٹھی اور کار خرید چُکا ہے۔ اب سلطانہ پر پھر بھی اس کا تصرف ہے۔ سلطانہ کے اس انجام پر ہمارا دل کڑھتا ہے لیکن نہیں ابھی اس کا انجام دُور ہے ——— خان بہادر میونسپلٹی کے چیئرمین بن چکے ہیں۔

فصل نہم میں سلیمان ایک ایم۔ ایل۔ اے کی بھتیجی سے شادی کر کے کراچی میں چار سو کی ملازمت حاصل کر لیتا ہے۔ نوشا راجہ کو اچانک ملتا ہے۔ وہ کوڑھ میں مبتلا ہے ایک ٹانگ کٹوا چکا ہے۔ نوشا اسکی خدمت میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس کا علاج کرانا چاہتا ہے لیکن اُسے اس کے لیئے ایک آدمی سے روپے چھین لینا پڑتے ہیں ——— نچلے طبقے کی تہذیب کی بنیاد تمام تر بد اخلاقی، سرکشی اور معصیت پر مبنی ہے۔ چوری، جوا، نشہ، جیب تراشی، امرد پرستی، بھیک ——— اور یہ سب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے ہے۔ نواب فرزند علی خان کی اتنی بڑی دھاندلی کو کوئی نہیں پوچھتا! اُلٹا سکائی لارکوں کو مقدمے میں ملوث کر دیا جاتا ہے۔ یہ ظلم ——— یہ تشدد کسی انقلاب کا تقاضا کرتا ہے، لیکن انقلاب کون برپا کرے، دُور دُور تک کوئی ستارہ نہیں ——— صفدر بشیر مر چکا ہے۔ سلیمان بڑا آدمی بننے کی فکر میں ہے۔ راجہ کوڑھی بن چکا ہے اور نوشا جیب کاٹ رہا ہے۔ ایک پروفیسر احمد علی کی ذات ہے جو خاموشی کے ساتھ اپنا مشن چلا رہا ہے ——— اور دُور افق کے اُس پار روشنی کی ایک ہلکی سی کرن اُبھر رہی ہے۔

آخری فصل میں نوشا کراچی سے گھر لوٹتا ہے اور نیاز کو قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ نیاز کے قتل کے بعد نواب فرزند علی خاں پھر بروئے کار آتے ہیں۔ اُس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیتے ہیں سلطانہ کو کچھ نہیں ملتا اس لیئے کہ وہ نیاز کی منکوحہ نہیں۔ سلیمان کی بیوی "الٹرا ماڈرن گرل" بن جاتی ہے۔ سلیمان اس کو طلاق دے کر واپس سکائی لارکوں میں آملتا ہے۔ یہی اُس کی آخری پناہ گاہ ہے۔ سلطانہ خودکشی کا ارادہ کرتی ہے، لیکن "فلک پیما" کا سہارا اُسے حیات نو بخشتا ہے۔ یہ سلیمان اور سلطانہ ہی کا نہیں، قاری کا بھی آخری سہارا ثابت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں، جبکہ ہر طرف مایوسی، شکست خوردگی، ناکامی اور محرومی کا دَور دورہ ہے، ایک جماعت ایسی بھی ہے، جو زندگی کا تحرک رکھتی ہے ——— اس میں کچھ کرنے کی اُمنگ ہے، انسانی ہمدردی کا جذبہ ہے۔ اس دَور میں جہاں نیاز اور خان بہادر ایسے لوگ انسانیت کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے سے دریغ نہیں کرتے، سکائی لارکوں کا وجود فرشتوں

سے کم نہیں۔ وہ فرشتے نہیں، خاکی فرشتے، جن کے سینے نُور سے معمور ہیں۔

ناول اختتام کو پہنچ چکا ہے نوشا جیل میں تھا اور خان بہادر فرزند علی خاں کے فرزند ارجمند غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ——— شہید وزارت نے یومِ آزادی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہی بات کہی تھی۔ ان کے اور بھائی بند بھی یہی بات کہتے ہیں اور عوام کے غم میں آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ اور عوام نوشا راجہ، شامی اور الّو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بنکر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی خون تھوکتا ہے اور رکشا چلاتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ رہ کر کولھے مٹکاتا ہے ——— نعرہ تکبر ——— اللہ اکبر" "یہ خدا کی بستی ہے اور یہ اس ناول کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ یہی اس کا مقصد بھی ہے اور یہی اس کا موضوع بھی!!

شوکت صدیقی نے اس موضوع کو بالکل فطری اور روزمرّہ گفتگو کے سے انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک خاص قسم کی کتابی، معیاری اور ادبی زبان کا چٹخارہ لینے والا قاری، اس ناول کو پڑھ کر یقیناً مایوس ہوگا کیونکہ اس میں ادبی حُسن کا شدید فقدان نظر آتا ہے۔ پریم چند نے اپنے آخری ناول "گئودان" اور آخری افسانے "کفن" میں اس زبان کی جس نئی طرز اور روش کو راہ دی تھی وہی آئندہ آنے والے قصّہ نویسوں کے لئے ایک صحت مند روایت ثابت ہوئی۔ "خدا کی بستی" میں بھی وہی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناول کے بیشتر کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے عوامی لب و لہجہ اور بے ساختہ عوامی زبان پورے ناول میں غالب نظر آتی ہے ایک مخصوص طبقے روزمرّہ اور اُن کی بعض مخصوص اصطلاحات کو پڑھ کر شوکت صدیقی کے مشاہدے پر حیرت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس طبقے کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ اکثر ان کے مشاہدے پر تجربے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جیب کتروں کی گفتگو دیکھئے۔

"بس کل تو تم دونوں بڑے فرنٹ گئے تھے آج کیا ہُوا؟"

"آج تو صرف ایک ہی موقع لگا۔ کل چار دفعہ کاریگری کی تھی"

"نہیں بے اتنی تیزی ٹھیک نہیں۔ تم نے کل یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ بس ایک دفعہ کاریگری دکھایا کرو۔ ورنہ دھر لیے جاؤ گے۔ جتنا ملے گا نہیں اتنا الفتے کھا جائیں گے"

اسی طرح

"استاد تو وہی سالا شہر بھر میں رہ گیا ہے۔ سالا خوامخواہ فنٹی مارتا پھرتا ہے۔ بس کپڑا ماری کے دو چار اُلٹے سیدھے ہاتھ جانتا ہے۔ وہ تو ذرا ذرا سے لونڈے بھی کر لیتے ہیں۔ سالا اب تک تیسری انگلی اناڑی کی طرح چلاتا ہے۔ انگوٹھا چلانا تو اس کو آج تک نہیں آیا۔ وہ کیا، بمبئی کے سیکھے ہوئے جتنے کاریگر ہیں

وہ سب سالے اناڑی ہیں۔

"اماں دیکھ رہے ہو اُستاد سالا خوامخواہ کے لئے مجھ سے فلاشٹین کر رہا ہے۔ وہ رانٹا دوں گا کہ بتیسی نکل پڑے گی"

"استاد پیڈرو نے اسکو گھور کر دیکھا ـــــ لا نکال جھکوں کی رانی کو" (گرہ کٹی سے آئی ہوئی رقم کے لیئے یہ مخصوص اصطلاح تھی)

ناول کی سب سے نمایاں اور اُبھرتی ہوئی خوبی یہ ہے کہ اس کے خالق نے آغاز سے انجام تک قاری کی توجہ اور دل چسپی کو اس طرح گرفت میں رکھا ہے کہ ایک لمحے کے لیئے بھی اس کو فرار کی راہ نہیں ملتی۔ وہ ناول نگار کی ساختہ فضا میں اس طرح محو ہو کر رہ جاتا ہے کہ اُسے گرد و پیش کا کچھ ہوش نہیں رہتا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ جس فضا میں گم ہوتا ہے وہ کوئی طلسماتی فضا یا خواب کی سی دُنیا ہو ـــــ نہیں یہ تو ایک ایسا ہی عالم ہے جس میں ہماری اپنی زندگی کی پوری دھڑکن موجود ہے۔ معاشرے کی ناہمواریاں، بلیک مارکیٹ، گداگری، یتیم خانے کی خرابیاں، بیکاری، جیب کترے، تعلیمی مسائل، مذہب کی آڑ میں ناجائز حربے، سول افسروں کی دھاندلی، رشوت ستانی، میونسپلٹی کے نقائص، خانقاہوں کی حالتیں، امرد پرستی، غرض وہ سب کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے جو ہماری اپنی زندگی میں، ہمارے اپنے معاشرے میں اور ہماری اپنی سوسائٹی میں عام ہے۔ ہمیں معلوم ہے یہ ہماری ہی زندگی کا عکس ہے۔ وُہ زندگی جس سے ہم بیزار ہیں، جس سے ہم آنکھیں چار نہیں کر سکتے لیکن ناول میں ہماری ہی زندگی ہمارے سامنے ہوتی ہے اور ہم اس میں کھو جاتے ہیں ـ اس میں پوری دل چسپی لیتے ہیں اور یہ اُس فنکار کا کمال ہے جس نے زندگی کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا ـ بے نقاب کر کے اُسے محسوس کرایا ہے۔ جن پہلوؤں کو ہم قابلِ نفرت سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں، آگے بڑھ جاتے ہیں، آج ایک فن کار نے اُن کو اہم بنا کر ہمیں اس میں محو کر دیا ہے۔

"خدا کی بستی" کرداری ناول نہیں چند کرداروں کی زندگی کے چند اہم اور فیصلہ کن سال اور ان چند سالوں میں اُن پر گزرنے والے واقعات اِس ناول کی کُل کائنات ضرور ہیں۔ اس محدود کائنات میں بڑی وسعت ہے۔ ناول کا کینوس وسیع نہیں لیکن ایک دَور کی پوری وسیع و عریض زندگی اس میں ضرور سمٹ آئی ہے ـ دراصل شوکت صدیقی نے کرداروں کے ذریعے مختلف طبقات کو پیش کیا ہے۔ راجہ، نوشا، سلطانہ وغیرہ نچلے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور زندگی سے نبھاہ کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے ہیں ـ دوسرا طبقہ جو سلیمان، احمد علی اور نیاز وغیرہ پر مشتمل ہے اوسط طبقہ ہے۔ اِن کا قیام مقام برزخ پر ہے جہاں اُن کو آتشیں شعلوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور خنک جھونکوں سے بھی۔ تیسرا طبقہ اُمرا کا ہے جن کی نمائندگی نواب فرزند علی خاں کر رہے ہیں ـ تمام کردار اتنے جاندار ہیں کہ ایک مدت تک ہم اُن کو فراموش نہیں کر سکتے ـ

ناول کا ابتدائی حصہ راجہ اور نوشا کے گرد گھومتا ہے۔ راجہ کا کردار ناول کے پہلے حصہ میں اتنا ابھر آتا ہے کہ ہم اُسے ناول کا ہیرو سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ پندرہ سال کا ناپختہ ذہن لڑکا ایک پختہ کار انسان کی طرح سوچتا ہے۔ دانش مند بوڑھے کی طرح بولتا ہے ـ

"یار تُو نے ناحق روک لیا ـ مر جاتا تو اچھا تھا ـ میرے مرنے سے کسی

کو دکھ نہ ہوتا، کوئی نہ روتا - میرا بیٹا ہی کون ہے - نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، کوئی بھی تو نہیں، کوئی نہیں ——— ہائے میرا کوئی نہیں"

اور آخر ایک حساس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے - راجہ جب بے بس ہوتا ہے تو رونے لگتا ہے - یہ انسان کی بے بسی کی انتہا ہے کہ جس کام کو ہم نہیں کرنا چاہتے وہ ہمیں کرنا پڑتا ہے - ہم جن کو دل سے چاہتے ہیں ان کو لوٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں - راجہ کے اندر زندگی کا تحرک ہے - وہ خودداری کا حامل ہے - کم سن ہوتے ہوئے بھی حالات سے لڑنے کا یارا رکھتا ہے - شاہ جی اور نورے جیسے خطرناک انسانوں کے سامنے نہ جھکنا اور اُن کے اشاروں پر نہ چلنے کا عزم اس کی دلیری اور جرأت مندی کا بیّن ثبوت ہے - راجہ کا انجام عبرت ناک ہے - وہ فٹ پاتھ پر پڑا زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے اور ایک کتّے کے سوا اس کا کوئی ساتھی نہیں ——— اب کوئی نوشا نہیں جو اُسکے علاج کے متعلق سوچ ہی لے اور آخر ایک روز وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیگا -

نوشا بھی اسی طبقے سے تعلق رکھنے والا نوجوان ہے جس طبقے کی پیداوار راجہ ہے - دونوں ایک ہی ماحول میں پروان چڑھنے اور زندگی کے بیشتر سال اکٹھے گزارنے کی وجہ سے ایک ہی نہج پر چل نکلتے ہیں - لیکن جس طرح دو فرد ایک مشترک ماحول میں پرورش پانے اور بعض مشترک خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح راجہ اور نوشا کے مزاجوں اور طبائع کے اتار چڑھاؤ میں بھی ایک خاص فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے - راجہ زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر خودکشی کا ارادہ بھی کرتا ہے - زندگی کی ناکامیوں کا شکوہ بھی کرتا ہے - وہ مصائب کے سامنے سینہ سپر تو ہوتا ہے لیکن اُس میں مقاومت کا زیادہ حوصلہ نہیں - لیکن اس کے مقابلے میں نوشا نوکِ خار پر مُسکرانے والا پھول ہے - وہ حالات کے دھارے پر بہتے ہوئے بھی اپنے دست و بازو پر بھروسہ رکھتا ہے - اُس میں زندگی کی مقاومت کا حوصلہ ہے - وہ ہر مصیبت جھیل جاتا ہے لیکن جب اُسے اپنی ماں اور بہن کی بے حُرمتی کا پتہ چلتا ہے تو وہ غیرت اور حمیّت کے جوش میں زندگی کو پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتا - راجہ کو زندگی سے نباہ کا درس دینے والا نوشا اب تمام مصلحتوں کو نظرانداز کر کے نیاز کے خون سے انتقام کی آگ بجھاتا ہے اور پھر بزدلوں کی طرح بھاگتا نہیں مُسکراتا ہوا اپنے تئیں قانون کے حوالے کر دیتا ہے - اس کا یہ فعل قانون اور اخلاق کے نقطۂ نظر سے غیر شائستہ ہو تو ہو، نوشا کو ایک باحوصلہ کردار ضرور ثابت کرتا ہے -

نواب فرزند علی خاں کا کردار ایک ایسے شخص کا کردار ہے جسکے ہونٹوں پر زہرخند مسکراہٹ کی ایک لہر ابھرتی ہے تو سینکڑوں سکائی لارکوں پر چاروں جانب سے سیل بلا اُمنڈ آتا ہے - جس کی آنکھوں میں روشنی کی ایک کرن پھوٹتی ہے تو ہزار ظلمتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے - جسکی معصومیت کے لبادے کے نیچے فیاض اور رحم الٰہی، سلطانہ جیسی بے شمار لڑکیوں کی عصمت کے دامن کو تار تار کر کے رکھ دیتے ہیں - جس کے ایک محل کی بنیادیں اٹھتی ہیں تو ہزاروں جھونپڑیاں سرنگوں ہو جاتی ہیں - ان کی شریعت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہزاروں مریضوں کی لاشوں پر مسجد کی تعمیر جائز ہے - سیلاب زدہ، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے مفلوک الحال لوگوں کے لئے بوسیدہ کمبل مہیا کر کے گورنمنٹ سے روپیہ کمانا عین ثواب ہے - نواب فرزند علی خاں زندگی کو

ایک سودا سمجھتے ہیں اور اس سودے کے لیئے روپیہ پیسہ، طاقت، ضمیر اور ایمان ہر چیز داؤ پر لگا دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ناول نگار نے اس کردار کو جس خاص مقصد کے لیئے منتخب کیا ہے وہ اس میں کامیاب ہیں۔ وہ نواب فرزند علی خاں کے لیئے "خدا کی بستی" کا مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں نفرت کا ایک جذبہ بیدار ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اور یہ مقصد انہوں پالیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نواب صاحب کے کردار کا محاسبہ نہیں کرتے۔ انہیں کیفرِ کردار تک نہیں پہنچاتے۔ راجہ کو اپنے گناہوں کا کفارہ کوڑھی بن کر ادا کرنا پڑا۔ نیاز کو اپنے کیئے کی سزا قتل کی صورت میں ملی۔ نوشا قتل کی پاداش میں حبس دوام کا شکار ہوا۔ شامی خون تھوک رہا ہے۔ انو ہیجڑا بنا کولھے مٹکا رہا ہے اور نواب فرزند علی خان

"وہ میونسپلٹی کا چیئرمین تھا۔ کئی کارخانوں کا مالک تھا —— اسمبلی کا ممبر بننے کی تیاری کر رہا تھا اور وزیر بننے کے لیئے سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ اس کے تعلقات کا دائرہ ملک سے نکل کر غیر ممالک تک پھیل چکا تھا۔ اس کا ایک لڑکا کولمبو پلان کے تحت لندن میں ٹریننگ لے رہا تھا اور دوسرا فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر پلو موٹا یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ ملک اور قوم کا بہی خواہ تھا اور اسکائی لارک قوم کے دشمن تھے۔ اسی لیئے وہ سکائی لارکوں کو کھلم کھلا یہ دھمکی دیا کرتا کہ وہ ان کو سیکورٹی ایکٹ کے تحت جیل بھجوا دے گا"

شوکت صدیقی ایک فن کار نہیں —— محض عوامی فنکار —— اُنہیں نواب فرزند علی خاں کے انجام سے کیا سروکار؟ اُنہیں تو راجہ، نوشا، سلطانہ، سلیمان، انو، نیاز وغیرہ کی زندگیوں سے دلچسپی ہے۔ وہ اُن سے محبت کرتے ہیں اور انہیں سزا بھی دیتے ہیں۔ نواب صاحب کو انہوں نے عوام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ معاشرے کا مجرم ہے —— عوام کا مجرم ہے لیکن وہ اُس سے صرف نفرت کر سکتے ہیں اور بس!!!

سلیمان کے کردار میں ہر قسم کی انسانی کمزوریاں موجود ہیں۔ وہ شراب پیتا ہے۔ بالاخانے پر جاتا ہے، جھوٹ بولتا ہے لیکن وہ حوصلہ مند ہے۔ اُس میں کام کرنے کا جذبہ ہے۔ وہ اپنے مقصد کے لیئے اپنی محبوبہ سلطانہ کو ٹھکرا دیتا ہے لیکن اُس کا انداز فکر اُسے عظمت عطا نہیں کرتا۔ سلطانہ سے شادی کی صورت میں وہ اُس کی کفالت اور بچوں کی پرورش کے بوجھ سے خائف ہو جاتا ہے۔ اُسے اس سے بلند تر ہونا چاہیئے تھا۔ کچھ دیر کے لیئے ہم اس پر جھنجھلاتے ہیں لیکن مقصد سے اس کا والہانہ لگاؤ اس جھنجھلاہٹ کا مداوا کرتا ہے اور ہم اُس کی قدر کرنے لگتے ہیں

کراچی میں قیام کے دوران میں اس حوصلہ مند اور پُرجوش نوجوان کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اور وہ ہے اسکی مصلحت کوشی اور بزدلی —— وہ ملازمت کے لیئے اپنی بیوی کی بدچلنی کو مسلسل برداشت کرتا چلا جاتا ہے۔ راجہ کے بعد ہم سلیمان کی ذات میں ناول کے ہیرو کو تلاش کرنے لگے تھے لیکن اس کا یہ "بھڑواپن" ہمارے دل میں اس کے لیئے نفرت کے جذبات بیدار کرتا ہے کہ وہ رخشندہ کو نشے کی حالت میں اپنے افسروں کے بازوؤں میں مچلتا ہوا دیکھتا ہے۔ مشتعل ہوتا ہے۔ ڈمی پر چاقو مارنے کی مشق کرتا ہے لیکن اس میں نوشا کا جگرا نہیں۔ وہ اپنی بزدلی کا جواز نکالتا ہے۔

"اُس نے سوچا وہ اُن کے لیئے کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتا ہے یہ

تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی سُور کا شکار کرتے ہوئے مارا جائے"۔

اور آخر اس کا حل نوکری سے استعفےٰ اور رخشندہ کو طلاق کی صورت میں نکلتا ہے اور ہمیں اچانک ہمارا کھویا ہوا ہیرو سلیمان مل جاتا ہے۔ اور جب وہ پھر سے سکائی لارک بننے کے لیئے ایک نئی اُمنگ اور ایک نئے جذبے کے ساتھ اُبھرتا ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ سلیمان "خدا کی بستی" کا ہیرو ہے۔ آئیڈل ہیرو نہیں۔ انسانی ہیرو ـــــ کمزور انسان، خاکی انسان ـــ لچکتی اور نرم مٹی کا پتلا جو حالات کی بھٹی میں پک پک کر کندن ہو گیا ہے۔ "فلک پیما" کے دفتر میں سلطانہ کو پا کر ذاتی اور شخصی آسودگی کا جذبہ اسکے دل میں ایک بار پھر ابھرتا ہے لیکن اب سلطانہ احمد علی کی بیوی بن چکی ہے۔ زندگی کی یہ آخری شکست اسکی ہزار فتح مندیوں کا پیش خیمہ ہے۔ اب سلیمان اپنی ذاتی آسودگی کا متمنی نہیں۔ وہ اپنی تمام تر صلاحتیں اجتماعی آسودگی کے لیئے وقف کر چکا ہے۔ اور یہی اس کی کامیابی ہے۔ یہی اُسکی عظمت ہے۔ اُس نے تجربات کی وادیوں میں بھٹک کر اپنی منزل کا تعیّن کیا ہے۔ اور اُس کی یہی عظمت اسے ناول کا ہیرو بناتی ہے۔

پروفیسر احمد علی کے کردار میں نکہت و نور کی جنتیں بسی ہوئی ہیں شعور و آگہی کے دیپک فروزاں ہیں۔ اس کے ہاں نور و نار کی آزمائشیں نہیں نور ہی نور ہے۔ روشنی ہی روشنی ہے۔ ظلمت کا نام نہیں۔ اس کے ہاں زندگی سے نباہ کا بھرپور جذبہ اور حسنِ عمل کی توانائی ہے۔ خلوص و محبت کے لامتناہی سائے ہیں جن کی چھاؤں میں زندگی کی شدّت اور حدّت سے جلے ہوئے سلیمان پناہ لیتے ہیں۔ پورے ناول میں وہی ایک کردار ہے جسکی پُر وقار اور پُر عظمت شخصیت کا سہارا ڈھونڈنے پر ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کا وہی ایک محور ہے اور بس ہر طرف تاریکی ہے، ظلمت ہے۔ جہاں روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی ہے تو وہ احمد علی کی شخصیت کا کرشمہ ہے۔ اس کے پاس ید بیضا بھی ہے اور عصائے کلیمی بھی۔ وُہ دلیل راہ بھی ہے اور نشانِ منزل بھی۔

سلطانہ ہمارے ہاں کی ہر وُہ لڑکی ہے جو نامساعد حالات کا شکار ہوتے ہوتے بھی کچھ خواب دیکھتی ہے ـــــ سہانے خواب لیکن یہ خواب تعبیر سے بیگانہ رہتے ہیں۔ سلطانہ کا دامن تر ہے لیکن اس "تردامنی" کے باوجود فرشتے اس کے سائے میں سکون حاصل کرتے ہیں ـــــ اُن میں ایک فرشتہ احمد علی ہے۔

اس ناول میں سلطانہ کی اہمیت میرے نزدیک یہی ہے کہ اُس نے ایاز کو جنم دیا، جس کی رگوں میں نیاز کا خون دوڑ رہا ہے لیکن جو فرشتے کے سائے میں پل رہا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وُہ مستقبل کا نیاز ہے یا کہ مستقبل کا احمد علی ـــــــــ لیکن نہیں دُور بہت دُور ہمیں ایک ایسا افق دکھائی دے رہا ہے جس کی سطح پر سلیمان، احمد علی، سلطانہ اور ایاز کے چہرے نمایاں ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ خان بہادر فرزند علی خاں اور نیاز اس افق کے دھندلکوں میں ڈوبتے چلے جا رہے ہیں۔ شوکت صدّیقی نے "مرگِ امید" کے آثار دیکھے ہیں لیکن اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور مستقبل کا یہی اشارہ اُن کے فن کو عظمت سے ہمکنار کرتا ہے۔

# باب المراسلہ والمناظرہ

## نگار کے ادارتی نوٹ کا (جو مولانا تمنا عمادی کے مضمون کے ذیل میں درج ہے) سرسری جائزہ

سید محمد ایڈوکیٹ مظفر پور

نگار پاکستان کا اکتوبر ۱۹۶۴ء کا شمارہ جو میرے عزیز نے بطور تحفہ کے مجھے دیا اس کے دو مضمون خاص طور
جاذب نظر اور نگار کے متنوع خصوصیات کے حامل ہیں۔ اس لئے میں نے ان دونوں مضمونوں کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ
کیا۔ ان دو مضمونوں میں سے ایک " حج بیت اللہ " سے متعلق تھا اور دوسرا تبصرہ تھا مولانا تمنا عمادی کا مولانا سلیمان
اخگر۔ کے مضمون شہادت عظمیٰ پر۔ میں نے نہ تو سلیمان اخگر صاحب کا مضمون پڑھا ہے اور نہ مولانا تمنا عمادی —
تبصرے پر سردست میں کوئی اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس کی مہلت ہے۔ اس سلسلے میں میں بھی علمائے کرام
شیعہ کو اظہار خیال کے لئے متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے علمائے کرام فرمائیں کہ بھائی یہ کون ایسا متنازعہ فیہ مسئلہ
جس پر متعدد مضامین اور کتابیں نہیں لکھی گئیں مگر میں دست بستہ عرض کردوں گا کہ کالرا یا پلیگ کے قسم کے متعدی بیماریاں
جب کبھی ظہور پذیر ہوتی ہیں تو اس کا تدارک لازمی ہوتا ہے اور صرف یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ " اس سلسلے میں تو سیکڑوں انجکشن اور دوا
نکل چکی ہیں۔ بہرحال میرے پیش نظر صرف نگار کا نوٹ ہے۔ جو مولانا تمنا کے مضمون کے ذیل میں درج ہے۔ اس نوٹ کی صرف مندرجہ
چند سطریں خاص طور پر میری توجہ کا مرکز ہیں۔ پورے مضمون کا مکمل جائزہ لینے سے میری عدیم الفرصتی اور کم بضاعتی مانع ہے۔ مو
فرماتے ہیں میری رائے میں بھی اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دونوں فریق کے بیانات پر سیاسی پروپیگنڈا —
ہٹ کر صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اس کی توقع ہم کو اپنے علماء سے تو کم تھی۔ لیکن اس خدمت کو مستشرقین
خود انجام دیا۔ ان مستشرقین میں لامنس ( Lammens ) اور ولہاسن ( Wellhausen ) اپنے تحقیقی ذوق کے لحاظ
خاص درجہ رکھتے ہیں۔ جنہوں نے اس مخصوص عہد کے مطالعہ کے لئے اپنی عمر کا بڑا حصہ وقف کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انھوں جو کچھ لکھ
وہ روایت و درایت دونوں کے توازن پر منحصر ہوگا۔ اور ہر شخص ثالث کی رائے کی حیثیت سے (جس کا تعلق نہ سنیوں سے ہے نہ ش
سے) زیادہ قابل اعتماد ہونا چاہئے "

نگار کے اس زریں اصول کے تحت میں اس مختصر مضمون کے آخر میں چند بلند پایہ مستشرقین کے خیالات بعض اہم اسلامی متنا
فیہ مسائل کے متعلق مندرج کر رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ مولانا نیاز اپنے قائم کردہ نظریہ کے تحت بلا خوف لومتہ لائم یہی فیص
فرمائیں گے کہ یہ سب نظریے " قابلِ اعتماد ہونا چاہئیں " اب رہا درائت اور روایت کا سوال کہ ان میں سے ایک دوسرے پر ک

حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے تو یہ بھی ایک بسیط مضمون چاہتا ہے جو میرے بس کی بات نہیں ۔ ایک امر قابل غور ہے ۔ مولانا نے جو مباحث اپنے گرانقدر تنقیدی نوٹ میں قائم کئے ہیں ۔ اس میں چوتھے مبحث کے بہ نسبت انھوں نے اپنا فیصلہ مولانا تمنّا کے خلاف دیا ہے اور اس کا جواب مولانا تمنّا ہی دیں گے ، دوسرا مبحث انھوں نے یوں لکھا ہے ۔" جناب حسینؓ کا خروج یزید کے خلاف نتیجہ تھا بعض اہل کوفہ کی بیجا تحریص و ترغیب کا ورنہ خود انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ خلافت سے تھی نہ اقتدار حکومت سے "، یعنی مولانا نے اس سلسلے میں پہلے یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ جناب حسین ...... نے یزید کے خلاف خروج کیا مگر منطقی و استدلالی حیثیت سے طریقہ Issue قائم کرنے کا نہیں ہوا کرتا ۔

سب سے زیادہ دلچسپ وہ سطریں ہیں جن میں مولانا نے واقعہ ہائے کربلا کا نچوڑ اپنے مضمون کی تین سطروں میں دیا ہے اور اس کو مولانا نے Policeaction سے تعبیر کیا ہے اسے مولانا ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ اصطلاح مولانا نے کہاں سے حاصل کی ۔ شاید ابھی تک مولانا کے دماغ میں باوجود ہجرت پاکستان ہند وستان کے ابتدائی دور آزادی کی کاروائی منقش ہے ۔ بہر کیف میں خیال کرتا ہوں کہ کسی اہم و طویل واقعہ کے ملخص یا نچوڑ کو چند لفظوں میں پیش کرنا بھی ایک ادبی صفت ہے اور ظاہر ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں مولانا ایک ادیب کی حیثیت سے بڑا درجہ رکھتے ہیں ۔ خاص طور سے اسلامی متنازعہ فیہ مسائل پر اظہار خیال کرنے میں بعد مولانا شبلی نعمانی کے مولانا ہی کا درجہ ہے اور تلخ سے تلخ بات بھی مولانا اس لطیف و شیریں پیرائے میں بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کی تلخی کو محسوس نہیں کر پاتا ۔ میں اس ملخص یا نچوڑ کے متعلق ایک لطیفہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

" دو شخص ہم سفر تھے ایک جگہ پہنچکر ان دونوں کے پاس بہت مختصر زاد راہ رہ گیا تھا جس سے دونوں شکم سیر نہیں ہو سکتے تھے ۔ جب دونوں کھانے پر بیٹھے تو ایک نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ کھانا کم ہے دوسرے کو باتوں میں الجھانا چاہا تاکہ وہ باتوں میں مشغول رہے اور یہ زیادہ سے زیادہ کھانا کھا سکے ۔ اسی نظریے کے ماتحت اس ایک نے دوسرے سے پوچھا ۔ برادر من قصۂ یوسف خوب است " دوسرے نے اس کے اصل مقصد کو تاڑتے ہوئے یہ چند جملے کہے " پیرے بود پسرے داشت گم کرد بازیافت ، یہ ہے قصۂ یوسف کا ملخص مولانا کے زاویۂ نظر سے ۔

مولانا کا واقعۂ کربلا کے متعلق یہ جملہ کہ یہ کوئی بڑا فوجی معرکہ نہ تھا کتنا ہی بلیغ سہی مگر اس کا ہر لفظ تشریح طلب ہے ، کسی معرکہ کو بڑا یا چھوٹا کہنے کے لئے کچھ اصول قائم کرنے ضروری ہیں اور پھر یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ وہ اصول کس زاویۂ نظر سے قائم کئے گئے ہیں ۔ یعنی مذہبی ، اخلاقی یا سیاسی کسی معرکہ کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا معیار مخالف صف آرا فوجوں کی تعداد پر نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ اس امر پر کہ اس معرکہ میں کتنا وقت صرف ہوا بلکہ ( کسی اور زاویۂ نظر سے نہ سہی تو مذہبی زاویۂ نظر سے تو ضروری ہے ) ہر قابل ذکر معرکہ کو ( میں نے قصداً بڑے یا چھوٹے کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے ) پرکھنے کے لئے اس کے اسباب و مقاصد کی چھان بین ضروری ہے ۔ فلسفہ تاریخ میں ہر قابل ذکر معرکہ کو پرکھنے و سمجھنے کے لئے اس کے اسباب و علل کی دو قسمیں کی گئی ہیں ۔ ایک Immediatecause اور دوسرا Remotecause تعجب ہے کہ مولانا نے اس پہلو کو قریباً نظر انداز کر دیا ہے ۔ مختصراً یہ کہ کربلا کے معرکہ کے متعلق میں اس بحث کو اس جملہ پر تمام کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخی اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس معرکہ کے نتیجہ میں " چند گھنٹوں میں نزاع حق و باطل ہوئی طے " ذیل میں چند مستشرقین کے خیالات مندرج کرتا ہوں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ۔ مختلف زمانے اور متفرق ممالک کے بے شمار غیر شیعی علماء و محققین نے جو کچھ اظہار خیال معرکۂ کربلا

د یزید کے متعلق فرمایا ہے اس کو نظر انداز کرتا ہوں ۔

ولا ملتجنب یدکفک الا شباً

یشرک فی القیامتہ ان تقراہ

Osborn اپنی کتاب Islam under Arabs میں جناب معاویہ پدر یزید کے متعلق حسب ذیل طور پر رقمطراز ہے :-

"Astute, unscrupulous, and pitiless the first Caliph of the Omayads shrank from no crime necessary to secure his position. Murder was his accustomed mode of removing an opponent. And yet this cool, calculating, atheistic Arab ruled over the regions of Arabia."

یہاں پر میں وہ جملہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں جسے مولانا نے منتخب فرمایا ہے اور وہ یہ ہے " اس نے (یعنی یزید نے) اپنے باپ امیر معاویہ کی پالیسی سے مطلق انحراف نہیں کیا"

Edward Gibbon اپنی کتاب Decline & fall of Roman Empire میں یوں لکھتا ہے ۔

"The birth, the alliance, the character of Ali which exalted him above the rest of his countrymen might justify his claim to the vacant throne of Arabia."

بعد میں وہ یوں لکھتا ہے :-

"The persutors of Mohamed usurped the inheritance of his children and the champions of idolatory became the supreme heads of his relegion and empire."

یزید کے متعلق وہ یوں اظہار خیال کرتا ہے ۔

"A feeble and desolute youth."

(ان الفاظ کا ترجمہ مولانا مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں)

واقعات کربلا کے متعلق اُس کا نظریہ حسب ذیل ہے :-

"In distent age and climate the tragic scene of death of Hussain will awaken the sympathy of the coldest reader."

لامنس Lammens کو لیجئے جو مولانا کے الفاظ میں اپنے تحقیقی ذوق کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتا ہے ۔ وہ اس نظریے کا حامی ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت ایک خاص گروہ کی کوشش کی مرہون منت تھی جو رسول اللہ کی وفات کے معاً بعد پیدا ہو گیا۔

یہ گروہ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت ابوعبیدہ جراح پر مشتمل تھا۔ وہ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس سازش میں حضرت عائشہ بھی شریک تھیں اور انھوں نے حضرت حفصہ کو بھی ملا لیا تھا۔

اس ضمن میں میں Ockleys History of Saracens کی طرف بھی مولانا کی توجہ مبذول کراؤں گا۔ جس کے اقتباسات اسوقت تفصیلاً میرے ذہن میں نہیں ہیں۔

---

(نگار) جناب سید محمد صاحب نے یہ خط مجھے نہیں بلکہ اپنے ایک دوست کو بھیجا تھا جو حسن اتفاق سے میرے بھی کرم فرما ہیں اور انھوں نے مجھے دیدیا، تاکہ میں اس پر اظہار خیال کرسکوں۔

یزید اور جناب حسین کے ذکر میں جس حد تک اخلاق و کردار کا سوال ہے۔ اس بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ ان دونوں میں خلافت کے لئے کون زیادہ موزوں تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا گویا ذرہ و آفتاب کی بحث چھیڑ دینا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی متنازع فیہ نہیں کہ اگر جناب حسین نے یزید کی خلافت کو چیلنج کیا تو یہ کوئی غلط مذہبی اقدام تھا۔ بلکہ سوال صرف واقعۂ کربلا کا ہے، جو اپنے نتیجہ کے لحاظ سے تو یقیناً بڑا اہم حادثہ تھا، لیکن محض واقعہ ہونے کی حیثیت سے وہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اسے کوئی اہم رزمیہ داستان قرار دیا جائے اور اس کی تفصیل میں بے شمار شہادت نامے اور مراثی لکھ دیے جائیں اور وہ بھی اتنی دقیق تفصیل کے ساتھ گویا کسی سینما فلم کا سنیریو لکھا جارہا ہے۔ ساٹھ ستر بے بس انسانوں کی محصور جماعت کا دشمن کے ہزاروں افراد سے مقابلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی لئے میں نے اسے پولیس ایکشن سے تعبیر کیا تھا۔

رہا سوال یزید کے کردار کا، سو اخلاقی یا مذہبی حیثیت سے وہ بھی قابل لحاظ نہیں اور اس کے مقابلہ میں جناب حسین کا ذکر کرنا، دراصل حضرت حسین کی توہین ہے۔ لیکن جس حد تک دنیاوی حکومت و سیاست کا تعلق ہے وہ یقیناً نااہل نہ تھا فسق و فجور اور بادہ خواری کے الزام سے اسے مذہبی خلافت کا نااہل تو ضرور قرار دیا جاسکتا ہے لیکن دنیاوی حکومت کا نہیں خلافت راشدہ کے بعد وہ کونسی مسلم حکومت ایسی تھی جس کے ملوک و امرا نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور پھر بھی ان کو شمار کامیاب و قابل حکمرانوں میں کیا جاتا ہے

(۳) میں سنی و شیعی اختلاف کو محض تاریخی یا روائتی اختلافات کا نتیجہ سمجھتا ہوں جس کا تعلق قطعاً مذہب سے نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ شیعی علماء نے جو اس کو خاص مذہبی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مولانا تمنا عمادی کے مضمون پر اظہار خیال نہیں کیا حالانکہ وعدہ تو کئی حضرات نے کیا تھا۔ خود میں نے مولانا کے مضمون پر جن خدشات کا ذکر کیا تھا اس کا جواب البتہ وہ خود تحریر کر رہے ہیں، جو آئندہ ماہ میں شائع ہوگا۔

(۳) رہا مسئلہ خلافت کا جس کے بابت لامنس کی روایت آپ کو پہنچی ہے کہ حضرت علی کو محروم خلافت کرنے میں ابوبکر۔ جناب عائشہ اور جناب حفصہ وغیرہ سب کے سب سازش میں شریک تھے، معاف فرمایئے ایک روایت مجھے بھی پہنچی ہے اور وہ یہ ہے کہ رحلت نبوی کے بعد ابوبکر۔ جناب عائشہ اور جناب حفصہ سب کے سب حضرت علی کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ کے داماد ہیں، وصی ہیں اس لئے منصب خلافت قبول کیجئے۔ آپ نے جواب دیا میں داماد تو ضرور ہوں لیکن وصی اصی کچھ نہیں ہوں، علاوہ بریں حضرت ابوبکر جیسے بزرگ کے ہوتے ہوئے جو رسول اللہ کے گہرے دوست و رفیق تھے اور جنھوں نے علالت رسول کے زمانے میں نماز کی امامت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ میرا کیا منھ ہے کہ منصب خلافت قبول کروں" لیکن آپ اس روایت کو غلط و موضوع کہہ دیں گے اور میں یہ سن کر خاموش ہوجاؤں گا حالانکہ اگر میں آپ کی بیان کردہ روایت کو غلط کہہ دوں تو آپ اسے تسلیم نہ کریں گے۔ کس قدر عجیب بات ہے۔

# باب الاستفسار

## (۱)
## کوہ و دمن

(سید مرتضیٰ حسین دیپالپور)

قدیم و جدید شعراء فارسی کے کلام میں "کوہ و دمن" دونوں کا استعمال اکثر ایک ساتھ ہوتا ہے اور اس سے مراد غالباً کوہ اور وادی کوہ ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لفظ دمن علیحدہ کیوں نہیں استعمال ہوتا۔ اگر یہ کوئی مفہوم اپنا جداگانہ بھی رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ بعض حضرات اس کے تلفظ میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔

---

(نگار) مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی صاحب نے اس لفظ کے متعلق مجھ سے استفسار کیا تھا اور میں نے اس کا جواب نگار ہی کے ذریعہ سے دیا تھا۔ ایک بار غالباً اقبال سہیل کے کسی شعر پر مجھ سے اور ان کے درمیان گفتگو بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی تفصیل اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔

لفظ (دَمَن) دراصل عربی لفظ ہے جو دَمَن، دَمِن، دِمَن اور دُمُن چاروں طرح مصدری معنی میں مستعمل ہے۔ بلکہ اس سے غیر ثلاثی مصادر کا بھی اشتقاق ہوتا ہے جیسے تدمین، تدمّن، اِدمان وغیرہ۔ اسم کی صورت میں یہ دِمَن اور دِمان ہے جس کے معنی اس مقام کے ہیں جہاں مویشی بول و براز کرتے ہیں اور گندگی کا مفہوم اس کے تمام مشتقات میں شامل رہتا ہے خواہ اس کا استعمال فعل کی صورت میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ چنانچہ جب کوئی درخت سڑ کر سیاہ ہونے لگتا ہے تو کہتے ہیں "دَمِن النخلُ"۔ چونکہ اس جگہ جہاں جانور بول و براز کرتے ہیں اکثر و بیشتر تری کی وجہ سے سبزہ بھی اُگ آتا ہے۔ اس لئے مجازاً اس کو بھی دِمَن کہنے لگے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اقبال سہیل نے اس کا مفہوم یہی سبزہ زار ظاہر کیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ دِمَن کے اسی عربی مفہوم کے پیش نظر انھوں نے ایسا کہا ہو۔ حالانکہ ایک گندی جگہ میں اُگ آنے والی گھاس کو سبزہ زار کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، فارسی میں دمن کو عربی قرار دینا درست نہیں کیونکہ دمن (عربی) وسعت فضا کے مفہوم سے بالکل خالی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ فارسی میں کوہ کے ساتھ دمن کا استعمال عربی مفہوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ دراصل مخفف ہے دامن کا چنانچہ دامن کوہ کہتے ہی ہیں کھلی ہوئی وادی کو جس میں اکثر سبزہ زار بھی پایا جاتا ہے۔

---

(۲)

## مشتاق احمد صدیقی۔ ٹیکسلا۔ راولپنڈی

آداب وتسلیمات۔

بارِ خاطر نہ ہو تو مندرجہ ذیل "شعر" کی تشریح فرما دیجئے۔ ممنون ہوں گا ۔

سُنا ہے کر دی ہیں الو کے پٹھے ____!

رگِ گل سے بلبل کے پَر باندھتے ہیں

---

(نگار) یہ شعر آپ نے غلط سُنا ہے۔ اس کا پہلا مصرعہ یوں ہے:۔

سُنا ہے کددرہ میں الو کے پٹھے

کددرہ باؤنی بندیلکھنڈ (یوپی) کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جواب ختم ہو گئی ہے۔ لیکن رئیس کا مستقر اب بھی کددرہ ہی ہے۔ حکومت سے ان کو پانچ ہزار ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ مشتاق الحسن خاں نام ہے۔

اس سے پہلے یہ ریاست باون گاؤں پر مشتمل تھی اور اسی لئے باؤنی کہلاتی تھی۔ اس ریاست کے بانی نظام دکن کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں کے تمام نواب لکھنؤ کے قرب کی وجہ سے تہذیب و معاشرت میں اودھ کی تہذیب سے کافی متاثر تھے اور شعر و سخن کا ذوق کسی وقت یہاں بہت عام تھا۔ اکثر مشاعرے ہوتے رہتے تھے جن میں شعراء لکھنؤ بھی شریک ہوتے تھے۔

ایک بار یہاں مصرع طرح یہ دیا گیا:۔

رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

اس پر لکھنؤ کے کسی دل جلے شاعر نے یہ گرہ لگائی کہ:۔

سُنا ہے کددرہ میں الو کے پٹھے

---

(۳)

## (سیّد ہادی حسن صاحب۔ مونگیر)

(۱) اہل سنت یعنی حنفیوں سے مراد تو وہ جماعت ہے جو ابوحنیفہ کی فقہ پر کاربند ہے۔ اس لئے دوسرے آٹھ فقہہ شافعی۔ مالک اور حنبل کے ماننے والوں کو تو اہل سنّت نہ کہنا چاہیئے۔ (۲) شیعی جماعت کے بہت سے فرقوں کے نام سُننے میں آتے ہیں۔ لیکن ابتدائی فرقے کون کون ہیں (۳) فقہہ کے جو چار امام سنیوں میں مشہور ہیں ان کے زمانوں میں کتنا اختلاف پایا جاتا ہے۔

---

(نگار) (۱) آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ اہل السنت والجماعۃ سے مراد صرف وہی جماعت ہے جو امام ابوحنیفہ کی فقہہ پر کاربند ہے۔ کیونکہ اہل تشیع کے مقابلہ میں آپ جب اہل سنت کا نام لیں گے تو پھر فقہہ حنفی کی کوئی قید باقی نہ رہے گی بلکہ

اس میں شافعی، حنبلی۔ مالکی اور حنفی فقہ کے پیرو سب کے سب شامل سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ خلافت و امامت کے مسئلہ میں یہ سب متحد الخیال ہیں۔ اور شیعی نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔

جس وقت سنی و شیعی تفریق کا سوال سامنے آتا ہے تو احکام فقہی کے اختلافات کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ محض عقیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور شیعی مذہب نام ہی ہے محض اس عقیدہ کا کہ نہ صرف حضرت علی تنہا منصوص من اللہ خلیفہ تھے بلکہ ان کے بعد بھی خلافت و امامت ابداً آباد آل فاطمہ ہی کے لئے منصوص ہو چکی ہے۔ جسے ابو حنیفہ کی طرح نہ شافعی تسلیم کرتے ہیں، نہ حنبلی، نہ مالکی اور اسی لئے ان چاروں ائمہ فقہ کے پیرو اہل السنت سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) آپ کا یہ خیال درست ہے کہ شیعی مذہب کے پیرو بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ لیکن ان کے قابلِ توجہ فرقے صرف دو ہیں۔ ایک سبعیہ یا اسماعیلیہ اور دوسرا اثنا عشری۔ ہر چند حق امامت و خلافت کے باب میں یہ دونوں متحد الخیال ہیں یعنی یہ کہ سلسلۂ امامت حضرت علی ہی کی نسل کے لئے مخصوص و منصوص ہے۔ لیکن اماموں کے تعین میں متفق نہیں۔ چھٹے امام جناب جعفر صادق تک تو یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن اس کے بعد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اسماعیلیہ یہ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے اپنے صاحبزادے اسماعیل کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا اور اثنا عشری جماعت کا یہ کہنا ہے کہ امام جعفر صادق نے اسماعیل کو محروم الارث کر کے اپنے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظم کی جانشینی کا اعلان کر دیا تھا۔

(۳) ائمہ فقہ میں سب سے پہلے ابو حنیفہ کا نام سامنے آتا ہے کیونکہ آپ ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۷۶۷ء میں انتقال کیا۔ ان کے بعد بہ لحاظ تاریخ ولادت امام مالک کا نمبر ہے۔ کیونکہ ان کی تاریخ پیدائش ۷۱۴ء ہے۔ لیکن صرف سات سال کا فرق کوئی قابل لحاظ فرق نہیں لیکن چونکہ ان کا انتقال ۷۹۵ء میں ہوا اور امام ابو حنیفہ کے بعد ۲۸ سال تک زندہ رہے اس لئے ان کو زمانہ مابعد کا فقیہ سمجھا جاتا ہے۔ تیسرا نمبر امام شافعی کا ہے جن کی ولادت کا وہی سال ہے جو امام ابو حنیفہ کی وفات کا اور چونکہ وہ امام مالک کے بعد بھی ۲۵ سال تک زندہ رہے۔ اس لئے ان کا ذکر امام مالک کے بعد آتا ہے۔ امام حنبل کا نام سب سے آخر میں اس لئے لیا جاتا ہے کہ وہ پیدا ہوئے ۷۸۰ء میں اور انتقال ہوا ۸۵۵ء میں۔


# تین اہم کتابیں

**تدریس اردو**
اردو تدریس پر فرمان فتحپوری کی عالمانہ تصنیف جو زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید ترین اصول و قواعد اور تازہ ترین قومی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ قیمت ۴/- روپے

**اردو رُباعی**
فرمان فتحپوری کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ جس میں اردو فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار رُباعی کے فن، موضوع اور ارتقاء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۵/- روپے

**تحقیق و تنقید**
تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ جس میں فرمان فتحپوری نے زبان و ادب کے نہایت اہم اور نئے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ قیمت ۳ روپے

# منظومات

## (محبوب الرحمان وامق عظیم آبادی)

میرے افسانے کو جزوِ داستاں رہنے بھی دو — سازِ عشرت میں جنوں کی تلخیاں رہنے بھی دو
کم سے کم کنجِ قفس میں اک خلش تو ہے مگر — ہم نے دیکھا ہے سکونِ آشیاں رہنے بھی دو
آرہی ہیں اب نظر کچھ کچھ جنوں کی منزلیں — ہو چکی اب مجھ سے فکرِ آشیاں رہنے بھی دو
چشمِ شبنم اشک افشاں ، سینۂ گل چاک چاک — سُن سکو گے تم نہ میری داستاں رہنے بھی دو
ہم نے دیکھا ہے سحر کو ڈوبتے تاروں کا حال — زندگانی اور نشاطِ جاوداں رہنے بھی دو
کس لئے کرتے ہو پھر تکلیفِ تجدیدِ وفا — زندگی سے بدگماں ہوں بدگماں رہنے بھی دو
نیند بھی ہے اک تسلی بیخودی بھی ہے نشاط — زندگی کو تم اگر خوابِ گراں رہنے بھی دو

اور بڑھ جائیں گی وامق زندگی کی تلخیاں
ذکرِ مہر و التفاتِ دوستاں رہنے بھی دو

---

## (شفقت کاظمی ڈیرہ غازی خاں)

بچھڑ گئے جو سرِ راہِ زندگی مجھ سے — کبھی پھر ان سے مقدر ملائے گا کہ نہیں
خزاں کے جور اٹھاتے رہیں گے ہم کب تک — کوئی بہار کا مژدہ سنائے گا کہ نہیں
بجا ہے عہدِ محبت مگر خدا جانے — وہ مجھ سے عہدِ محبت نبھائے گا کہ نہیں

بلا کی کشمکشِ انتظار ہے شفقت
وہ غم نصیب تجھے یاد آئے گا کہ نہیں

---

وہ بھول کر بھی سرِ رہ گزر نہیں آتا — میں جس کو ڈھونڈ رہا ہوں نظر نہیں آتا
گزر رہے ہیں بڑے اضطراب میں لمحے — کوئی سکون کا پہلو نظر نہیں آتا

دیا ہے دردِ جگر جس نے کاظمی ہم کو
اُسی سے چارۂ دردِ جگر نہیں آتا

---

## اکرم ڈھولیوی

دیکھی کوئی خوشی بھی تو رنجور ہو گئے — دل گیر کتنے اب ترے مہجور ہو گئے
جوشِ جنونِ شوق نے بھٹکا دیا کہاں — منزل سے رہ نورد بہت دور ہو گئے
پایا کچھ اس طرح انھیں مائل بہ التفات — ہم آج عرضِ شوق پہ مجبور ہو گئے
دنیا یونہی بدلتی ہے معلوم ہو گیا — تم آئے اور دکھ مرے سب دور ہو گئے
اللہ رے نزاکتِ اندازِ بے رخی — اب وہ ستم بھی کرنے سے معذور ہو گئے
آخر سمجھ میں شیوۂ تسلیم آ گیا — اب ہم بھی شاکیٔ دلِ رنجور ہو گئے

---

ہم تک حریمِ حسن کی لاتا کوئی خبر — خانہ خرابِ عشق سے اتنا نہیں ہوا
آئندہ دل رہے نہ رہے اختیار میں — اب تک تو ان کی یاد میں ایسا نہیں ہوا
ہم خار و خس ہی چنتے نشیمن کے واسطے — گلچیں کو اسقدر بھی گوارا نہیں ہوا
اپنے لئے تو ہو گا قیامت کا دن وہی — جس روز اُدھر سے وعدۂ فردا نہیں ہوا

اکرم مآلِ شوق ہے آنکھوں کے سامنے
کہئے ابھی یقین ہوا یا نہیں ہوا

---

## واحد پریمی

آزاد تو برسوں سے ہیں اربابِ گلستاں — آئی نہ مگر طاقتِ پرواز ابھی تک
جس گیت کو چھیڑا تھا کبھی سازِ وفا پر — آتی ہے اُسی گیت کی آواز ابھی تک
رونق نہ تھی جب مجھ سے تو پھر کوئی بتائے — سونی ہے وہ کیوں انجمنِ ناز ابھی تک

---

مری طرف جو کسی شوخ کی نظر اٹھی — تو ہوک درد کی از قلب تا جگر اٹھی
شبِ فراق کئی بار گوشۂ دل سے — اٹھی تو آہ مگر آہ بے اثر اٹھی
کسی کے رنگِ تغافل سے تازگی پا کر — ہماری حسرتِ دل اور بھی نکھر اٹھی
وہیں وہیں ترے جلوے بکھیر آئی ہے — ہماری چشمِ تمنا جدھر جدھر اٹھی
اسی کو میں نے بنایا ہے ہمسفر واحدؔ
غبار بن کے جہاں گردِ رہ گزر اٹھی

---

(الطاف شاہدؔ)

تم میرے وطن سے آئے ہو، خاموش ہو کیوں، ہاں کچھ تو کہو
کیا دل پہ تمھارے بیتی ہے، احوالِ غمِ جاں کچھ تو کہو

یہ رُخ پہ اُداسی کے سائے بیتاب کئے دیتے ہیں مجھے
مجھ کو بھی شریکِ غم سمجھو، رودادِ گلستاں کچھ تو کہو

وہ امن و سکوں کا گہوارہ، آباد ہے یا تاراج ہوا
سب عیش کیا کرتے ہیں وہاں، یا سب ہیں پریشاں کچھ تو کہو

کیا حال ہے اب مختاروں کا، جباروں کا، قہاروں کا
تعمیر ہوا کرتے ہیں وہاں، میخانے کہ زنداں کچھ تو کہو

کیا اب بھی برنگِ جاہ و حشم، خوشیوں پہ اجارہ داری ہے
کیا اب بھی سسکتے رہتے ہیں، ہر قلب کے ارماں کچھ تو کہو

کیا اب بھی ساون آتا ہے، کیا اب بھی جھولے پڑتے ہیں
اُتنا ہی سہانا ہوتا ہے، کیا موسمِ باراں کچھ تو کہو

صد رشکِ جناں، صد رشکِ ارم، رہتے تھے جہاں سیمیں بدن
آباد ہے یا برباد ہوا، وہ شہرِ نگاراں کچھ تو کہو

کیا اب بھی فضائے میخانہ، ہے مست برنگِ پیمانہ
کیا رات ڈھلے رہتا ہے وہی، اب جمعِ رنداں کچھ تو کہو

کیا طرزِ ادائے دلجوئی، اب بھی ہے حسینوں میں باقی
کیا اب بھی کوئی سی دیتا ہے، عاشق کا گریباں کچھ تو کہو

اک میرے چلے آنے سے وہاں، بگڑا تو نہیں نظمِ محفل
کیا اب بھی غزل کی رعنائی، ہے شمعِ دبستاں کچھ تو کہو

شاہدؔ بھی تمھارے دیس کا ہے، اس کو نہ رکھو تاریکی میں
کیا کھویا ہے؟ کیا پایا ہے؟ تم کیوں ہو پریشاں کچھ نہ کہو

## اداس

(فضا جالندھری)

دل پریشاں ہر دبال دوش ہے تیرے بغیر
ہر نفس اب محشر خاموش ہے تیرے بغیر

دل لرزے خوابیدہ، دل ڈوبا ہوا جی ہے اداس
زندگی ناآشنائے ہوش ہے تیرے بغیر

گریہ پیہم جو پہلے اتنا کون دل کا راز
وہ بھی گویا شکوۂ خاموش ہے تیرے بغیر

دل میں چبھتی ہیں شب مہتاب کی رعنائیاں
تلخ لطفِ بادۂ سرجوش ہے تیرے بغیر

اب کہاں وہ دورِ جام و دعوتِ ابر و ہوا
آتش دل شعلہ بخس پوش ہے تیرے بغیر

آنکھ جب ساقی سے ملتی ہے تڑپ جاتا ہے دل
نیش سے کچھ بڑھ کے تلخ اب نوش ہے تیرے بغیر

چوٹ سی لگتی ہے دل پر رقصِ انجم دیکھ کر
کس کو لطف زندگی کا ہوش ہے تیرے بغیر

موسم گل میں بھی مجھ پر ہے خزاں چھائی ہوئی
فکر فردا بے نیازِ دوش ہے تیرے بغیر

آ کہ اک مدت سے ویراں ہے حریم حسن و عشق
زہر ہے کہ، نغمہ بارِ گوش ہے تیرے بغیر

آ کہ بڑھتا جا رہا ہے یاس و حسرت کا ہجوم
عشرتوں سے دل تہی آغوش ہے تیرے بغیر

نغمہ بن کر پھر سما جا دل میں اے جانِ بہار
میرا ہر تارِ نفس خاموش ہے تیرے بغیر

تیرے دم سے تھی فضا کی زندگی بھی پُرفضا
اب کسے ان عشرتوں کا ہوش ہے تیرے بغیر

---

(ساحر بھوپالی)

آنا پڑا مجھی کو سرِ دارِ آرزو
جب زندگی کا کوئی نگہباں نہیں رہا

اللہ میرے آئی بھی تو آئی کب بہار
جب پھاڑنے کو کوئی گریباں نہیں رہا

---

شب کے سینے سے پھوٹی، صبح کی کرن یارو
زندگی نے سی ڈالا موت کا کفن یارو

وصل بھی میسر ہے، دید بھی میسر ہے
سونی سونی ہے پھر بھی، دل کی انجمن یارو

ہر ستم زمانے کا ہم نے جھیلا ہنس ہنس کر
تب کہیں ہمیں آیا جینے کا یہ فن یارو

جیتے جی ہے ناممکن یاں سکون کا ملنا
موت ہی اتارے گی، زیست کی تھکن یارو

کچھ خبر ہے ساحر کی جو تلاش انساں میں
پھر رہا ہے سرگرداں، ہو کے بے وطن یارو

# مطبوعات موصولہ

**نیاز فتحپوری**

## حیات اقبال کا ایک جذباتی دور

نام ہے جناب پروفیسر محمد عثمان کے ان مضامین کے مجموعہ کا جن میں زیادہ مختلف عنوانات و زوایا سے انھوں نے اقبال کی مفکرانہ حیثیت پر گفتگو کی ہے لیکن اس مجموعہ کا نام انھوں نے محض "حیات اقبال کا ایک جذباتی دور" رکھا ہے کیونکہ جو مضمون اس عنوان سے لکھا گیا ہے اس کی تحریر میں بقول خود ان کو بڑی عرق ریزی کرنا پڑی ہے اور غیر معمولی احتیاط سے کام لیا گیا ہے ۔ اس مضمون میں جو اب سے سات سال قبل ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا فاضل مقالہ نگار نے اقبال کے ابتدائی خاصِ حیات و تاثرات شباب پر جس محتاط تفصیل اور حسن تعبیر سے گفتگو کی ہے وہ اس میں شک نہیں بڑی دلچسپ کوشش ہے اور ان صحائف و مقالات کے انبار میں جو اس وقت تک اس موضوع پر لکھے گئے ہیں خاصی نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔ اس مضمون میں ہمارے سامنے مفکر اقبال نہیں بلکہ حسن پرست اقبال کو پیش کیا گیا ہے جس کی زندگی اس اعتبار سے شروع بھی ہوئی المیہ پر اور ختم بھی ہوئی المیہ پر گو اس دوران میں گاہ گاہ انھیں اپنے قلبی اضطراب کو سکون سمجھنے پر بھی قناعت کرنا پڑی ۔

اس مضمون کا آغاز اقبال کی پہلی شادی سے ہوتا ہے جسے ان کی روداد غم کی پہلی شب سمجھنا چاہیے اور اختتام ہوتا ہے عطیہ فیضی سے قریب تر نہ رہ سکنے کی حسرت پر جسے اقبال کے ساز زندگی کے ٹوٹے ہوئے تار کی جھنکار کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون کو اقبال کی محبت ناکام کے اظہار میں داستان گوئی سے نہ کام لیتے ہوئے بھی بڑی دلچسپ داستان بنا دیا ہے ۔ جس میں فسانوی تسلسل بھی ہے اور نقادانہ غور و تامل بھی ۔ اسی سے ملتا جلتا دوسرا مضمون "نوجوان شاعر اقبال" ہے جس میں ان کے دلولۂ شباب کے کسی خاص واقعہ سے تو بحث نہیں کی گئی ہے لیکن عہد جوانی کے ان شاعرانہ و الہانہ تاثرات کو بیشک کافی وضاحت سے پیش کر دیا گیا ہے جو گوشت و خون سے کم اور دل و دماغ سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ۔ اس مضمون میں مصنف نے قصداً اقبال کے اس دور شاعری کا ذکر نہیں کیا جس کا آغاز داغ کی شاگردی سے ہوا تھا بلکہ اس دور کا ذکر کیا ہے جسے فکر حکیمانہ کہتے ہیں اور جو بڑھتے بڑھتے خودنگری، خودشکنی اور عشق و پیمبری تک پہنچ جاتا ہے ۔ اس موضوع پر مصنف کو زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ جب حسن و عشق کے باب میں بات فلسفہ کی چل پڑے تو غیر ذمہ دارانہ باتیں کرنے کی کافی گنجائش نکل آتی ہے ۔ برخلاف اس کے جب وہ ایک اور مضمون میں خصوصیت کے ساتھ اقبال کی عشقیہ شاعری پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی احتیاط پھر عود کر آتی ہے کیونکہ یہ انھیں اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی شخص یہ کہے

"اقبال کی شاعری بہت گھٹیا درجہ کی شاعری ہے" محض اس لیئے کہ ان کا عشق عورت سے نہیں بلکہ خدا یا پیمبر سے تھا، میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے بحث کا جو پہلو اختیار کیا ہے وہ ذرا منطقی انداز کا ہے اور یہ ظاہر کر کے کہ اقبال نے اپنا ابتدائی کلام تلف کر دیا تھا۔ گویا انھوں نے معترض کے اس اعتراض کو ایک حد تک تسلیم کر لیا ہے ........ حالانکہ شاعری کے گھٹیا یا بڑھیا ہونے کا تعلق موضوع سے اتنا نہیں جتنا تاثرات کی نوعیت و انداز بیان سے ہے۔ خدا اور رسول سے عشق کرنے کے بعد بھی ایک شخص گھٹیا شعر کہہ سکتا ہے۔ اور عورت سے محبت کرنے کے بعد بھی شعر میں تنزیہی بلندی پیدا کر سکتا ہے۔

ان تین مضامین کے علاوہ آٹھ مقالے اور اس مجموعہ میں شامل ہیں جن میں زیادہ اہم میرے نزدیک صرف تین ہیں۔ ایک وہ جس میں قرآن کی آئینی حیثیت پر اقبال کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے، دوسرا وہ جو روس کے نظریہ اشتراکیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تیسرا وہ جس میں تردید خودی و بقا[؟] مقالہ نگار دنیائے تصوف کے مفروضات سے بحث کی گئی ہے۔ اول الذکر مضمون میں مقالہ نگار نے اقبال کو ایک مذہبی واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو کوئی ندرت اپنے اندر نہیں رکھتا لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ اگر کوئی فلسفی بھی خدا لگتی بات کہے تو کیا مضائقہ ہے۔ اسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم مابعد الطبیعیاتی مسائل پر بھی اقبال کو ضرور کچھ نہ کچھ کہنا چاہیئے تھا لیکن انھوں نے کھل کر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی حالانکہ اس کی ضرورت یقیناً تھی۔ اشتراکیت والے مقالہ میں اقبال کے جن تصورات کو پیش کیا گیا ہے وہ اس میں شک نہیں بالکل درست نہیں اور اسلام بلاشبہ اشتراکیت کا نہیں تو جمہوریت یا سوشل ڈیماکریسی کا یقیناً حامی ہے لیکن اقبال کی یہ خوش خیالی کہ ممکن ہے کسی وقت روس کا الحاد توحید اسلام کی صورت اختیار کرلے البتہ بڑی عجیب بات ہے اور بالکل ایسی ہی ہے جیسے قفس سے آزاد ہو جانے والے طائر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ پھر قفس میں لوٹ آئے گا۔ روس نے انکار خدا سے اپنے پندار میں ایک بڑے ذہنی بوجھ سے اپنے آپ کو آزاد کیا ہے اور وہ اس بار گراں کے اٹھانے کی ہمت اب کبھی نہیں کرے گا۔

تیسرا مضمون جس میں رجحان تصوف پر بحث کی گئی ہے بیشک بہت معقول ہے حالانکہ اس سلسلہ میں یہ گفتگو ضروری تھی کہ اگر تصوف اقبال کے لیئے ناقابل قبول شے تھی تو ان پر رومی کے اثرات کی کیا نوعیت تھی اور تصوف سے ہٹ کر رومی کی وہ کونسی تعلیم تھی جس نے نفسیاتی طور پر اقبال کو متاثر کیا ورنہ یوں تو رومی کے یہاں بھی ان تعلیمات کی کمی نہیں جو اقبال کے فلسفہ عمل اور نظریہ حیات کے منافی ہیں۔

ایک مضمون میں اقبال کے نظریہ خودی پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے لیکن صرف سیاسی پس منظر کو سامنے رکھ کر اور یہ تخصیص غالباً اس لئے ضروری تھی کہ الٰہیاتی دائرے سے اسے علیحدہ رکھا جائے کیونکہ اس صورت میں اس کے ڈانڈے تصوف سے مل جاتے ہیں۔ ایک باب میں مصنف نے بڑی خصوصیت کے ساتھ اقبال کی ایک اقتصادی تالیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو انھوں نے اول اول لکھی تھی اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اقبال نے اس کتاب میں ملک کے جن معاشی حالات و مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور سرمایہ و عمل کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے اسے بھی فاضل مقالہ نگار نے ایجاز کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ آخری باب اصلاح تعلیم سے تعلق رکھتا ہے اور اس سلسلے میں اقبال نے جو مفید مشورے دیئے ہیں انھیں بھی مقالہ نگار نے کافی وضاحت سے پیش کر دیا ہے۔

کسی مصنف کے کارناموں پر خواہ وہ علمی ہوں یا ادبی اسی شخص کو اظہار رائے کا حق حاصل ہو سکتا ہے جو بالکل خالی الذہن

ہو کر غور و تامل کے فن سے واقف ہے۔ ورنہ اگر وہ پہلے ہی سے ذہنی طور پر مصنف سے مرعوب ہے تو اس کی تحریر مدحیہ قصیدہ ہو کر رہ جائے گی اور اگر مصنف کے حالات کا مخالف ہے تو اس کی تنقید تنقیص ہو جائے گی اور یہ دونوں باتیں نقاد کی دیانت کے منافی ہیں۔ لیکن ہوتی ہے عموماً یہی ایک طرفہ بات۔ چنانچہ اس وقت تک اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر اسی رنگ کا ہے۔ یعنی یا تو وہ اخذ و اقتباس یا تکرار خیال و روایات کی حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر زیر نظر کتاب کے مضامین ذرا مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ یعنی مصنف نے اپنے آپ کو اقبال کے تصورات میں گم نہیں کر دیا بلکہ ذرا دور ہٹ کر ان کا مطالعہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اقبال کے ساتھ ان کی شیفتگی روایتی حیثیت نہ اختیار کرے جس میں وہ ہر جگہ تو نہیں لیکن اکثر و بیشتر کامیاب ہوئے ہیں۔ اس نوع کے تنقیدی لٹریچر میں جس کا تعلق ایک بندھے ٹکے موضوع سے ہو اور اختلاف کی بھی کم گنجائش ہو اس کی بے نمکی کو ہمیشہ طرز تحریر و اسلوب و بیان کی شیرینی ہی سے دور کیا جاتا ہے اور یہ خصوصیت اس کتاب میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہ مجموعہ متداول کتابی سائز کے صرف ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اقبال کی زندگی اور ان کے اہم نظریات کو بڑے دلکش ایجاز کے ساتھ ان میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ جدید نے بڑے اہتمام سے مجلد شائع کیا ہے۔ گو اس کی قیمت سات روپے کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ (نشر یہ ریڈیو پاکستان)

## سرد چراغاں

جویا آنولوی کا مجموعہ کلام ہے۔ منشی رام بہادر لال جویا، قوم کے کایستھ اور قصبہ آنولا (بریلی) کے متوطن تھے۔ شعر گوئی ان کا پیشہ نہیں بلکہ ذاتی مشغلہ تھا۔ طبیعت رسا پائی تھی اور شاعری میں زبان و بیان کی پاکیزگی کا بھی بہت لحاظ رکھتے تھے، وہ جو کہتے تھے، سوچ سمجھ کر فنی ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ کہتے تھے۔ اساتذہ قدیم کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان میں سے اکثر کے رنگ سخن کو نبھانے کی کوشش بھی کی ہے چنانچہ اکثر غزلیں انھوں نے اساتذہ فن کی زمینوں میں کہی ہیں اور حتی الامکان جدت و ندرت سے بھی کام لیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں غزلیں، نظمیں اور مرثیے شامل ہیں جو سبھی قابل توجہ ہیں اور جویا کی استادی کے مظہر۔ انھوں نے اپنے دور کی اکثر سیاسی و ملی تحریکوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اپنی جگہ خوب ہے۔

ایک سو پچاس صفحات کا یہ مجموعہ جس میں جگر بریلوی اور منور لکھنوی کے مقدمات بھی شامل ہیں۔ دو روپے چھتر پیسے میں نسیم بکڈپو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

## یدبن معاویہ

چھوٹی تقطیع کے بہتر صفحات کا یہ مختصر کتابچہ دراصل رسالہ ہے امام ابن تیمیہ کا۔ جسے شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی کے فاضل اُستاد جمیل احمد صاحب نے عربی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ رسالہ حقیقتہً جواب ہے اس استفسار کا جس میں ابن تیمیہ سے پوچھا گیا تھا کہ

"کیا یزید بن معاویہ صحابی تھا؟ جو اسے صحابی سمجھتا ہو یا مانتا ہو اس کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے، نیز کیا صحابہ میں کسی کا نام یزید تھا؟"

جواب میں ابن تیمیہ نے لکھا۔ یزید بن معاویہ بن ابوسفیان صحابی نہیں تھا۔ اس کے چچا یزید بن سفیان البتہ صحابی تھے۔ یزید بن معاویہ دیگر اموی و عباسی خلفاء کی طرح ایک اموی خلیفہ تھے اور ان خلفاء میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو کافر ہو۔ سب کے سب مسلمان تھے۔ ان میں خوبیاں بھی تھیں اور برائیاں بھی۔ اب جو شخص یہ کہے گا کہ یزید بن معاویہ صحابی تھا وہ کاذب ہے اسی طرح جو یزید اور اس کے والد حضرت معاویہ کو کافر سمجھے گا اور یہ کہے گا کہ اس نے امام حسین کو دل کی بھڑاس نکالنے اور

اپنے کافر رشتہ داروں کا انتقام لینے کے لیئے شہید کرایا تھا وہ بھی جھوٹا اور افترا پردازی ہے۔"

امام ابن تیمیہ نے استفسار پر خلافت راشدہ کے حالات کا تاریخی جائزہ لے کر استدلال شرعی کے ساتھ مفصل بحث کی ہے اور یزید بن معاویہ و یزید بن ابوسفیان کے متعلق بہت سے مغالطوں کو دور کر دیا ہے۔

جمیل احمد صاحب نے اس رسالے کو نہایت سادہ، رواں اور پاکیزہ اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ چونکہ انھوں نے اصل متن بھی دیدیا ہے اور آغاز میں ابن تیمیہ کے حالات زندگی بھی باختصار درج کر دیئے ہیں۔ اس لیئے یہ رسالہ زیادہ مستند و افادی ہوگیا ہے۔ یقین ہے کہ تاریخ اور اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے استفادہ کریں گے۔ کتاب ابن تیمیہ اکیڈمی ملیر ایکسٹینشن کالونی کراچی ۲۷ سے مل سکتی ہے۔ قیمت البتہ درج نہیں ہے۔

## اقبال کا تصور عشق

از ڈاکٹر غلام عمر خاں - ناشر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے - صفحات ۱۰۴

ڈاکٹر غلام عمر خاں، نظام کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں اور اقبال و اقبالیات سے خاص شغف رکھتے ہیں اس سے پہلے ان کی مختصر کتاب "روح اسلام اقبال کی نظر میں" منظر عام پر آچکی ہے اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے زیر نظر کتاب میں انھوں نے اقبال کے "تصور عشق" کو بحث کا موضوع بنایا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے صرف یہی نہیں کہ اقبال کے سارے اردو فارسی کلام کو نظر میں رکھا ہے بلکہ اقبال کے خطبات، خطوط، نثری کتب اور دوسرے ملفوظات کو بھی سامنے رکھا ہے اور دوسرے ناقدین کی طرح صرف داخلی شہادتوں پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ خارجی حالات و واقعات سے بھی استنباط نتائج کیا ہے۔ اسی لیئے وہ عشق کے سلسلے میں، اقبال کے موقف و عقیدے کی تشریح بڑی خوش اسلوبی سے کرگئے ہیں

کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن مصنف نے جو کچھ کہنا چاہا ہے بڑی جامعیت کے ساتھ کہہ دیا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف صرف فلسفۂ اقبال پر نہیں بلکہ زبان و بیان پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

## فواید نافعہ بر عجالہ نافعہ

فارسی زبان میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا رسالہ ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے علم حدیث کے فواید و غایات، راویوں کے نام، کتب حدیث کے اقسام اور علم حدیث کی اسناد سے متعلق، بعض اہم معلومات فراہم کی ہیں - چنانچہ یہ رسالہ علم حدیث سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ و طلبۂ دونوں کے لیئے مفید ہے اور اسی لیئے حدیث کی تدریس میں شروع سے داخل نصاب رکھا گیا ہے۔ اور پاک و ہند کے مختلف مطبعوں سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کی اسی افادیت کے پیش نظر محمد عبدالحلیم چشتی فاضل دیوبند نے اس فارسی رسالے کو اردو نثر کا جامہ پہنایا ہے۔

چشتی صاحب چونکہ عربی و فارسی کے ساتھ اردو زبان و ادب سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں، اس لیئے صرف یہی نہیں کہ وہ ترجمے کی کٹھن منزلوں سے بہ آسانی گزر گئے ہیں بلکہ انھوں نے خیالات والفاظ کے نازک رشتہ کو بھی ذہن میں رکھا ہے۔

۱۰۴ صفحات کی یہ کتاب سفید کاغذ پر عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور پندرہ یا بارہ روپیہ میں نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی سے مل سکتی ہے۔

---

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ

علی شبیر خاں - محلہ کھنزانہ کلاں - رائے بریلی (یو-پی)

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ

# مومن نمبر

(مرتبہ :- نیاز فتحپوری)

**مومن** اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو **شیخ حرم** بھی ہے اور **رند شاہد باز** بھی، اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رُونما ہوئی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کیلئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اسکا صحیح اندازہ

## "مومن نمبر"

کے مطالعہ سے ہوگا،

اس نمبر میں مومن کی سوانح۔ حیاتِ معاشقہ۔ اس کی غزل گوئی۔ قصیدہ نگاری مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہوگیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے **مومن** پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے ٭ قیمت :- چار روپے

مینیجر **نگارِ پاکستان** ٭ ۳۲ ٭ گارڈن مارکٹ ٭ کراچی ۳

# اسٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۹۶۳ء

## مندرجہ ذیل شاخیں بنکاری کی تمام تر خدمات انجام دیتی ہیں

## شاخیں

**مغربی پاکستان**

| | | |
|---|---|---|
| بٹ خیلا | سرگودھا | کھاریاں چھاؤنی |
| بنوں چھاؤنی | سیالکوٹ | کوئٹہ |
| پشاور | کراچی :- | گوجرانوالہ |
| چرات | بندر روڈ | لاہور :- |
| حیدرآباد :- | پی - ای - سی - ایچ - ایس | انارکلی |
| پرنس علی روڈ | جوڑیا بازار | چھاؤنی |
| شاہی بازار | ڈنڈاس اسٹریٹ | شاہ عالم گیٹ |
| خضدار | فش ہاربر | لائلپور |
| راولپنڈی :- | لارنس روڈ | لیہ |
| چھاؤنی | منوڑہ | مردان |
| راجہ بازار | میکلوڈ روڈ | ملتان |
| سخاکوٹ | نرسری | منٹگمری |

**مشرقی پاکستان**

| | | |
|---|---|---|
| چٹاگانگ :- | ڈھاکہ | زنزیرا |
| ایم - اے جناح روڈ | چھاؤنی | نرائین گنج |
| خاتون گنج | مغل ٹولی | کھلنا |
| | موتی جھیل | |

یہ شاخیں بنکاری کی تمام تر سہولتیں مہیا کرنے کے لئے دنیا بھر کے ملکوں سے منسلک ہیں

ہیڈ آفس :-
محمدی ہاؤس
میکلوڈ روڈ
کراچی

اے - میکلین
جنرل منیجر